اس شمارے میں

حرف اوّل

رجوع الی القرآن کورس (پارٹ 1) — حافظ عاطف وحید — 2

مطالعہ قرآن حکیم

سورۃ البقرۃ (آیات ۶۰ تا ۷۴) — ڈاکٹر اسرار احمد — 3

فہم القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح — لطف الرحمٰن خان — 17

تذکیر و موعظت

مشرکوں کی محرومیاں — حافظ محمد سلیمان — 29

حکمت نبویؐ

دولت مند کا خسارہ کیا ہے؟ — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ — 32

دعوت فکر

مدرسین قرآن کے لیے خصوصی ہدایات — حافظ محمد زبیر — 35

بحث و نظر

فناءِ نار کا عقیدہ — حافظ محمد ارشد عمری — 49

تعارف و تبصرہ — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ — 61

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا
(البقرة: ۲۶۹)

دارالمطالعہ قرآن اکیڈمی
نمبر 7-9-06
۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

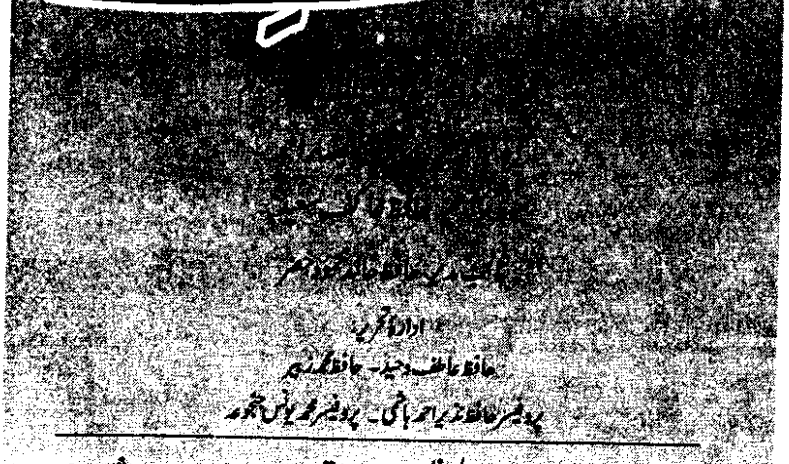

مدیر: حافظ خالد محمود خضر

ادارۂ تحریر
حافظ عاطف وحید۔ حافظ محمد زبیر
پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی۔ پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

جلد ۲۵ — شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ۔ ستمبر ۲۰۰۶ء — شمارہ ۹

مکتبہ از مطبوعات
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون 3-5869501
publications@tanzeem.org
ویب سائٹ: www.tanzeem.org

سالانہ زرِ تعاون: 100 روپے، فی شمارہ: 10 روپے
انڈیا: 700 روپے۔ ایشیا، یورپ، افریقہ: 1100 روپے۔ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا: 1400 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رجوع الی القرآن کورس (پارٹ I) میں نئے داخلے

تقریباً نو ماہ کے دورانیے پر مشتمل ''رجوع الی القرآن کورس'' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تعلیمی مساعی میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ یہ کورس بحمد اللہ بائیس تیئیس سال سے انتہائی پابندی کے ساتھ منعقد کیا جا رہا ہے اور اب تک سینکڑوں کی تعداد میں خواتین و حضرات اس کورس سے اپنی علمی پیاس بجھانے کا سامان کر چکے ہیں۔

اتنی کثیر تعداد میں تعلیم یافتہ خواتین و حضرات کا فہمِ قرآن کے حصول کے لیے سال بھر کا وقت فارغ کرنے کا فیصلہ کر لینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہمارا معاشرہ ابھی سعادت سے بانجھ نہیں ہوا اور اس میں دعوت الی الخیر اور رجوع الی القرآن کی پکار پر لبیک کہنے والے موجود ہیں۔ اس کورس کے شرکاء کی بڑھتی ہوئی تعداد سے اس حقیقت کی غمازی بھی ہوتی ہے کہ مرکزی انجمن خدام القرآن کے صدر مؤسس محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ نے آج سے قریباً چالیس سال قبل رجوع الی القرآن کا جو پودا لگایا اور اسے ایک طویل عرصے تک اپنے خونِ جگر سے سینچا' اب وہ ایک تناور درخت بن کر برگ و بار لا رہا ہے۔

رجوع الی القرآن کورس سے ہر سال استفادہ کرنے والے مرد و خواتین میں سے کچھ نہ کچھ تعداد ایسی سعید روحوں کی بھی ضرور نکل آتی ہے جو دروسِ قرآن کے حلقوں اور تدریسِ عربی کی کلاسز کے ذریعے تعلّم و تعلیم قرآن کے اس ''بہترین'' کام میں مشغول ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اس سال اس کورس کو جن اساتذۂ کرام کی رفاقت و راہنمائی میسر ہے وہ سب اسی کورس کے فارغ التحصیل ہیں اور اب اعزازی طور پر تدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اس سال بھی اِن شاء اللہ العزیز ۴ ستمبر سے اس کورس کا نیا سیشن شروع ہو رہا ہے۔ کورس کو ترتیب دیتے ہوئے اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ شرکاء نہ صرف عربی زبان کے بنیادی قواعد اور اسالیب سے واقف ہو جائیں' تاکہ قرآن حکیم کی ابدی ہدایت سے براہِ راست استفادے کی راہ ہموار ہو سکے' بلکہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے مربوط مطالعے کے ذریعے دین کا صحیح تصور اور فرائض دینی کا ایک جامع خاکہ بھی ان پر واضح ہو جائے۔ مزید برآں مطالعۂ احادیث نبویؐ کا ایک مختصر نصاب' تجوید' ترجمہ و ترکیب قرآن اور مطالعۂ فقہ بھی شاملِ نصاب ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی کتابِ عزیز کے تعلّم و تعلیم کے ضمن میں ہونے والی جملہ مساعی کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین! oo

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ البقرۃ

آیات ۶۰ تا ۶۱

﴿وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝﴾

اب یہاں پھر صحراءِ سینا کے واقعات بیان ہو رہے ہیں۔ ان واقعات میں ترتیب زمانی نہیں ہے۔ اریحا کی فتح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوئی' جس کا ذکر گزشتہ آیات میں ہوا' لیکن اب یہاں پھر اُس دَور کے واقعات آ رہے ہیں جب بنی اسرائیل صحرائے تیہہ میں بھٹک رہے تھے۔

آیت ۶۰ ﴿وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ﴾

''اور جب پانی مانگا موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے تو ہم نے کہا ضرب لگاؤ اپنے عصا سے

چٹان پر۔''

صحرائے سینا میں چھ لاکھ سے زائد بنی اسرائیل پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے اور وہاں پانی نہیں تھا۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پانی طلب کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اپنی قوم کے لیے پانی کی دعا کی تو انہیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اپنے عصا سے چٹان پر ضرب لگاؤ۔

﴿فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا﴾ ''تو اُس سے بارہ چشمے پھوٹ بہے۔''

''فَجَرَ'' کہتے ہیں کوئی چیز پھٹ کر اُس سے کسی چیز کا برآمد ہونا۔ فجر کے وقت کو فجر اسی لیے کہتے ہیں کہ اُس وقت رات کی تاریکی کا پردہ چاک ہوتا ہے اور سپیدۂ سحر نمودار ہوتا ہے۔

﴿قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ﴾ ''ہر قبیلے نے اپنا گھاٹ جان لیا (اور معین کرلیا)۔''

بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے' اگر ان کے لیے علیحدہ علیحدہ گھاٹ نہ ہوتا تو ان میں باہم لڑائی جھگڑے کا معاملہ ہوتا۔ انہیں بارہ چشمے اسی لیے دیے گئے تھے کہ آپس میں لڑائی جھگڑا نہ ہو۔ پانی تو بہت بڑی چیز ہے اور قبائلی زندگی میں اس کی بنیاد پر جنگ و جدل کا آغاز ہوسکتا ہے۔ ؎

کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
کہیں گھوڑا آگے بڑھانے پہ جھگڑا

تو اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے یہ سہولت مہیا کی کہ بارہ چشمے پھوٹ بہے اور ہر قبیلے نے اپنا گھاٹ معین کرلیا۔

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ﴾ ''(گویا ان سے یہ کہہ دیا گیا کہ) کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق میں سے''

﴿وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ﴾ ''اور زمین میں فساد مچاتے نہ پھرو۔''

صحرا میں ان کے لیے پینے کو پانی بھی مہیا کر دیا گیا اور کھانے کے لیے مَن وسلویٰ اتار دیا گیا' لیکن انہوں نے ناشکری کا معاملہ کیا' جس کا ذکر ملاحظہ ہو۔

﴿وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ﴾ ''اور یاد کرو جب کہ تم نے کہا تھا اے موسیٰ! ہم ایک ہی کھانے پر صبر نہیں کر سکتے'' من وسلویٰ کھا کھا کر

اب ہم اُکتا گئے ہیں۔

﴿فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ﴾ ''تو ذرا اپنے ربّ سے ہمارے لیے دعا کرو''

﴿يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ﴾ ''کہ نکالے ہمارے لیے اس سے کہ جو زمین اُگاتی ہے''

یعنی زمین کی پیداوار میں سے' نباتاتِ ارضی میں سے ہمیں رزق دیا جائے۔

﴿مِنْ بَقْلِهَا﴾ ''اُس کی ترکاریاں''

﴿وَقِثَّائِهَا﴾ ''اور ککڑیاں''

یہ لفظ کھیرے اور ککڑی وغیرہ سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

﴿وَفُومِهَا﴾ ''اور لہسن''

فُوم کا ایک ترجمہ گیہوں کیا گیا ہے' لیکن میرے نزدیک زیادہ صحیح ترجمہ لہسن ہے۔ عربی میں اس کے لیے بالعموم لفظ ''ثُوم'' استعمال کیا جاتا ہے۔ لہسن کو فارسی میں ثُوم اور پنجابی' سرائیکی اور سندھی میں ''تھوم'' کہتے ہیں اور یہ فُوم اور ثُوم ہی کی بدلی ہوئی شکل ہے' اس لیے کہ عربوں کی آمد کے باعث اُن کی زبان کے بہت سے الفاظ سندھی اور سرائیکی زبان میں شامل ہو گئے' جو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ کافی تعداد میں اب بھی موجود ہیں۔

﴿وَعَدَسِهَا﴾ ''اور مسور''

﴿وَبَصَلِهَا﴾ ''اور پیاز۔''

اب جو سالن کے چٹخارے ان چیزوں سے بنتے ہیں اُن کی زبانیں وہ چٹخارے مانگ رہی تھیں۔ بنی اسرائیل صحرائے سینا میں ایک ہی طرح کی غذا ''مَن وسلویٰ'' کھاتے کھاتے اُکتا گئے تھے' لہٰذا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ ہمیں زمین سے اُگنے والی چٹخارے دار چیزیں چاہئیں۔

﴿قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ﴾ ''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کیا تم وہ شے لینا چاہتے ہو جو کم تر ہے اُس کے بدلے میں جو بہتر ہے؟''

مَن وسلویٰ نباتاتِ ارضی سے کہیں بہتر ہے جو اللہ کی طرف سے تمہیں دیا گیا ہے۔ تو اس سے تمہارا جی بھر گیا ہے اور اس کو ہاتھ سے دے کر چاہتے ہو کہ یہ ادنیٰ چیزیں تمہیں ملیں؟

﴿اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُم مَّا سَأَلْتُمْ﴾ ''اترو کسی شہر میں تو تم کو مل جائے گا جو کچھ تم مانگتے ہو۔''

لفظ ''اِهْبِطُوْا'' پر آیت ۳۸ کے ذیل میں بات ہو چکی ہے کہ اس کا معنی بلندی سے اترنے کا ہے۔ ظاہر بات ہے یہاں یہ لفظ آسمان سے زمین پر اترنے کے لیے نہیں آیا' بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہو گا کہ کسی بستی میں جا کر آباد ہو جاؤ! (settle down somewhere) اگر تمہیں زمین کی پیداوار میں سے یہ چیزیں چاہئیں تو کہیں آباد (settle) ہو جاؤ اور کاشت کاری کرو' یہ ساری چیزیں تمہیں مل جائیں گی۔

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ﴾ ''اور ان پر ذلت وخواری اور محتاجی و کم ہمتی تھوپ دی گئی۔''

﴿وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ ''اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے۔'' وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔

بنی اسرائیل وہ اُمت تھی جس کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ (البقرۃ) اسی اُمت کا پھر یہ حشر ہوا تو کیوں ہوا؟ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے! انہیں کتاب دی گئی تھی کہ اس کی پیروی کریں اور اسے قائم کریں۔ سورۃ المائدۃ میں فرمایا گیا:

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ﴾ (آیت ۶۶)

''اگر یہ (اہل کتاب) تورات اور انجیل اور اُن دوسری کتابوں کو قائم کرتے جو اُن کی جانب ان کے ربّ کی طرف سے اتاری گئیں تو کھاتے اپنے اوپر سے اور اپنے قدموں کے نیچے سے۔''

یعنی ان کے سروں کے اوپر سے بھی نعمتوں کی بارش ہوتی اور زمین بھی ان کے لیے نعمتیں اُگلتی۔ لیکن انہوں نے اس کو چھوڑ کر اپنی خواہشات' اپنے نظریات' اپنے خیالات' اپنی عقل اور اپنی مصلحتوں کو مقدم کیا' اور اپنے تمرّد' اپنی سرکشی اور اپنی حاکمیت کو بالاتر کیا۔ جو قوم دنیا میں اللہ کے قانون' اللہ کی ہدایت اور اللہ کی کتاب کی امین ہوتی ہے وہ اللہ کی نمائندہ (representative) ہوتی ہے' اور اگر وہ اپنے عمل سے غلط نمائندگی (misrepresent) کرے تو وہ اللہ کے نزدیک کافروں سے بڑھ کر مغضوب اور مبغوض ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ کافروں کو دین پہنچانا تو اِس مسلمان اُمت کے ذمہ تھا۔ اگر یہ خود ہی دین سے منحرف ہو گئے تو کسی اور کو کیا دین پہنچائیں گے؟ آج اس مقام پر موجودہ اُمتِ

مسلمہ کھڑی ہے کہ تعداد میں سوا ارب یا ڈیڑھ ارب ہونے کے باوجود ان کے حصے میں عزت نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ دُنیا کے سارے معاملات G-7 اور G-15 ممالک کے ہاتھ میں ہیں۔ سکیورٹی کونسل کے مستقل ارکان کو ویٹو کا حق حاصل ہے' لیکن کوئی مسلمان ملک نہ تو سکیورٹی کونسل کا مستقل رکن ہے اور نہ ہی G-7' G-9 یا G-15 میں شامل ہے۔ گویا ع کس نمی پُرسد کہ بھیا کیستی! ہماری اپنی پالیسیاں کہیں اور طے ہوتی ہیں' ہمارے اپنے بجٹ کہیں اور بنتے ہیں' ہماری صلح اور جنگ کسی اور کے اشارے سے ریموٹ کنٹرول انداز میں ہوتی ہیں۔ یہ ذلت اور مسکنت ہے جو آج ہم پر تھوپ دی گئی ہے۔ ہم کہتے ہیں کشمیر ہماری شہ رگ ہے' لیکن اس کے لیے جنگ کرنے کو ہم تیار نہیں ہیں۔ یہ خوف نہیں ہے تو کیا ہے؟ یہ مسکنت نہیں ہے تو کیا ہے؟ اگر اللہ پر یقین ہے اور اپنے حق پر ہونے کا یقین ہے تو اپنی شہ رگ دشمن کے قبضے سے آزاد کرانے کے لیے ہمت کرو۔ لیکن نہیں' ہم میں یہ ہمت موجود نہیں ہے۔ ہمارے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر خبریں آتی رہیں گی کہ قابض بھارتی فوج نے ریاستی دہشت گردی کی کارروائیوں میں اتنے کشمیریوں کو شہید کر دیا' اتنی مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کر دی' لیکن ہم یہاں اپنے اپنے دھندوں میں' اپنے اپنے کاروبار میں' اپنی اپنی ملازمتوں میں اور اپنے اپنے کیریئرز میں مگن ہیں۔ بہرحال متذکرہ بالا الفاظ اگرچہ بنی اسرائیل کے لیے آئے ہیں کہ ان پر ذلت وخواری اور محتاجی وکم ہمتی مسلط کر دی گئی' لیکن اس میں آج کی اُمت مسلمہ کا نقشہ بھی موجود ہے ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں!

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ ''یہ اس لیے ہوا کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے''

﴿وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ ''اور اللہ کے نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے۔''

ہمارے ہاں بھی مجدد دین اُمت کو قتل بھی کیا گیا اور اُن میں سے کتنے ہیں جو جیلوں میں ڈالے گئے۔ متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سینکڑوں تابعین مستبد حکمرانوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ ائمہ دین کو ایسی ایسی مار پڑی ہے کہ کہا جاتا ہے کہ ہاتھی کو بھی ایسی مار پڑے تو وہ برداشت نہ کر سکے۔ امام احمد بن حنبلؒ کے ساتھ کیا کچھ ہوا! امام ابوحنیفہؒ نے جیل میں انتقال کیا اور وہاں سے اُن کا جنازہ اٹھا۔ امام دارالہجرت امام مالکؒ کے کندھے

کھینچ دیے گئے اور مُنہ کالا کر کے انہیں اُونٹ پر بٹھا کر پھرایا گیا۔ حضرت مجدّد الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کو پس دیوار زنداں ڈالا گیا۔ سید احمد بریلویؒ اور ان کے ساتھیوں کو خود مسلمانوں نے شہید کروا دیا۔ ہماری تاریخ ایسی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ اب نبی تو کوئی نہیں آئے گا۔ اُن کے ہاں نبی تھے' ہمارے ہاں مجدّدین ہیں' علماء حق ہیں۔ انہوں نے جو کچھ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کیا وہی ہم نے مجدّدین کے ساتھ کیا۔

﴿ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝﴾ ''اور یہ اس لیے ہوا کہ وہ نافرمان تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔''

ان کو یہ سزا اُن کی نافرمانیوں کی وجہ سے اور حد سے تجاوز کرنے کی وجہ سے دی گئی۔ اللہ تعالیٰ تو ظالم نہیں ہے (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ نے تو انہیں اُونچا مقام دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھی ''خیر اُمت'' قرار دیا۔ ہم نے بھی جب اپنا مشن چھوڑ دیا تو ذلت اور مسکنت ہمارا مقدر بن گئی۔ اللہ کا قانون اور اللہ کا عدل بے لاگ ہے۔ یہ سب کے لیے ایک ہے' ہر اُمت کے لیے الگ الگ نہیں ہے۔ اللہ کی سنت بدلتی نہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی بداعمالیوں کے سبب ان کا جو حشر ہوا آج وہ ہمارا ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں میری کتاب ''سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کا ماضی' حال اور مستقبل'' کے نام سے موجود ہے' اُس کا مطالعہ کیجیے!

آیات ۶۲ تا ۶۶

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِى السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۝ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾

اب وہ آیت آ رہی ہے کہ جس سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ نجاتِ اُخروی کے لیے ایمان بالرسالت ضروری نہیں ہے۔

آیت ۶۲ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''یقیناً جو لوگ ایمان لائے''

اور اس سے مراد ہے جو ایمان لائے محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر۔

﴿وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی﴾ ''اور جو یہودی ہو گئے اور نصرانی''

﴿وَالصّٰبِـُٔوْنَ﴾ ''اور صابی''

صابی وہ لوگ تھے جو عراق کے علاقے میں رہتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ ہم دینِ ابراہیمی پر ہیں۔ لیکن اُن کے ہاں بھی بہت کچھ بگڑ گیا تھا۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل بگاڑ کا شکار ہو گئی تھی اسی طرح وہ بھی بگڑ گئے تھے اور ان کے ہاں زیادہ تر ستارہ پرستی رواج پا گئی تھی۔

﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ''جو کوئی بھی ایمان لایا (ان میں سے) اللہ پر اور یومِ آخر پر''

﴿وَعَمِلَ صَالِحاً﴾ ''اور اُس نے اچھے عمل کیے''

﴿فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ﴾ ''تو اُن کے لیے (محفوظ) ہے اُن کا اجر اُن کے ربّ کے پاس''

﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝﴾ ''اور نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ غمگین ہوں گے۔''

ان لوگوں کو نہ تو کوئی خوف دامن گیر ہوگا اور نہ ہی وہ کسی حزن سے دوچار ہوں گے۔ ظاہر الفاظ کے اعتبار سے دیکھیں تو یہاں ایمان بالرسالت کا ذکر نہیں ہے۔ اگر کوئی اس سے غلط استدلال کرتا ہے تو اس کا پہلا اصولی جواب تو یہ ہے کہ بعض احادیث میں ایسے الفاظ بھی موجود ہیں: ((مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ)) تو کیا اس کے یہ معانی ہیں کہ صرف لا الٰہ الا اللہ کہنے سے جنت میں داخل ہو جائیں گے' کسی عمل کی ضرورت نہیں؟ بلکہ کسی حدیث کا مفہوم اَخذ کرنے کے لیے پورے قرآن کو اور پورے ذخیرۂ احادیث کو سامنے رکھنا ہوگا۔ کسی ایک جگہ سے کوئی نتیجہ نکال لینا صحیح نہیں ہے۔ لیکن اس کے علاوہ چھٹے رکوع کے آغاز میں یہ اصولی بات بھی بیان کی جا چکی ہے کہ سورۃ البقرۃ کا پانچواں رکوع چھٹے رکوع سے شروع ہونے والے سارے مضامین سے ضرب کھا رہا ہے' جس میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ اور آپ پر

نازل ہونے والے قرآن پر ایمان لانے کی پُر زور دعوت بایں الفاظ موجود ہے:

﴿وَاٰمِنُوْا بِمَا اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ﴾

''اور ایمان لاؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے' جو تصدیق کرتے ہوئے آئی ہے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے' اور تم ہی سب سے پہلے اس کا کفر کرنے والے نہ بن جاؤ''۔

اب فصاحت اور بلاغت کا یہ تقاضا ہے کہ ایک بات بار بار نہ دہرائی جائے۔ البتہ یہ بات ہر جگہ مقدر (understood) سمجھی جائے گی۔ اس لیے کہ ساری گفتگو اسی کے حوالے سے ہو رہی ہے۔ اس حوالے سے اب یوں سمجھئے کہ آیتِ زیرِ مطالعہ میں ''فِیْ اَیَّامِھِمْ'' یا ''فِیْ اَزْمِنَتِھِمْ'' (اپنے اپنے دَور میں) کے الفاظ محذوف مانے جائیں گے۔ گویا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا [فِیْ اَیَّامِھِمْ] فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾

یعنی نجاتِ اُخروی کے لیے اللہ تعالیٰ اور روزِ قیامت پر ایمان کے ساتھ ساتھ اپنے دَور کے نبی پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ جب تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں آئے تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے جو بھی یہودی موجود تھے' جو اللہ پر ایمان رکھتے تھے' آخرت کو مانتے تھے اور نیک عمل کرتے تھے ان کی نجات ہو جائے گی۔ لیکن جنہوں نے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد اُنؑ کو نہیں مانا تو اب وہ کافر قرار پائے۔ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام رسولوں پر ایمان نجاتِ اُخروی کے لیے کافی تھا' لیکن محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپؐ پر ایمان نہ لانے والے کافر قرار پائیں گے۔

آیت زیرِ مطالعہ میں اصل زور اس بات پر ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ کسی گروہ میں شامل ہونے سے نجات پا جاؤ گے' نجات کسی گروہ میں شامل ہونے کی وجہ سے نہیں ہے' بلکہ نجات کی بنیاد ایمان اور عمل صالح ہے۔ اپنے دَور کے رسول پر ایمان لانا تو لازم ہے' لیکن اس کے ساتھ اگر عمل صالح نہیں ہے تو نجات نہیں ہوگی۔ قرآن مجید کے ایک مقام پر آیا ہے:

﴿وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ﴾ (الاعراف: ۳۴)

''اور ہر اُمت کے لیے ایک خاص معین مدت ہے''۔

ہر اُمت اس معینہ مدت ہی کی مکلّف ہے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے فوت ہو گئے ان پر تو آپ ﷺ پر ایمان لانے کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ بعثتِ نبویؐ سے قبل ایسے موحدین مکہ مکرمہ میں موجود تھے جو کعبہ کے پردے پکڑ پکڑ کر یہ کہتے تھے کہ اے اللہ! ہم صرف تیری بندگی کرنا چاہتے ہیں' لیکن جانتے نہیں کہ کیسے کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہنوئی اور فاطمہؓ بنت خطاب کے شوہر حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ (جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں) کے والد زید کا یہی معاملہ تھا۔ وہ یہ کہتے ہوئے دنیا سے چلے گئے کہ: ''اے اللہ! میں صرف تیری بندگی کرنا چاہتا ہوں' مگر نہیں جانتا کہ کیسے کروں''۔

سورۃ الفاتحہ کے مطالعہ کے دوران میں نے کہا تھا کہ ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان توحید تک پہنچ جاتا ہے' آخرت کو پہچان لیتا ہے' لیکن آگے وہ نہیں جانتا کہ اب کیا کرے۔ احکامِ شریعت کی تفصیل کے لیے وہ ''رَبِّ الْعَالَمِین'' اور ''مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' کے حضور دستِ سوال دراز کرنے پر مجبور ہے کہ: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ اُسی صراط مستقیم کی دعا کا جواب یہ قرآن حکیم ہے' اور اس میں سورۃ البقرۃ ہی سے احکامِ شریعت کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے کہ یہ کرو' یہ نہ کرو' یہ فرض ہے' یہ تم پر لازم کیا گیا ہے اور یہ چیزیں حرام کی گئی ہیں۔

آیت ۶۳ ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾ ''اور ذرا یاد کرو جب ہم نے تم سے قول و قرار لیا اور تمہارے اوپر اٹھا دیا کوہِ طور کو۔''

بنی اسرائیل کو جب تورات دی گئی تو اُس وقت ان کے دلوں میں اللہ اور اس کی کتاب کی ہیبت ڈالنے اور خشیت پیدا کرنے کے لیے معجزانہ طور پر ایک ایسی کیفیت پیدا کی گئی کہ اُن کے اوپر کوہِ طور اٹھا کر معلق کر دیا گیا۔ اُس وقت ان سے کہا گیا:

﴿خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ﴾ ''پکڑو اس کو مضبوطی کے ساتھ جو ہم نے تم کو دیا ہے۔'' اس کتاب تورات کو اور اس میں بیان کردہ احکامِ شریعت کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو۔

﴿وَاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ﴾ ''اور یاد رکھو اسے جو کچھ کہ اس میں ہے''

﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝﴾ ''تاکہ تم بچ سکو۔''

آیت ۶۴ ﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ ''پھر تم نے روگردانی کی اُس کے بعد۔'' یعنی جو میثاقِ شریعت تم سے لیا گیا تھا اُس کو توڑ ڈالا۔

﴿فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ ''پھر اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی نہ ہوتی تو تم (اُسی وقت) خسارہ پانے والے ہو جاتے۔''

اگر اللہ تعالیٰ کا فضل تمہارے شاملِ حال نہ ہوتا اور اس کی رحمت تمہاری دستگیری نہ کرتی رہتی، تمہیں بار بار معاف نہ کیا جاتا اور تمہیں بار بار مہلت نہ دی جاتی تو تم اُسی وقت تباہ ہو جاتے۔

آیت ۶۵ ﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ﴾ ''اور تم انہیں خوب جان چکے ہو جنہوں نے تم میں سے زیادتی کی تھی ہفتہ کے دن میں''

تمہیں خوب معلوم ہے کہ تم میں سے وہ کون لوگ تھے جنہوں نے سبت کے قانون کو توڑا تھا اور حد سے تجاوز کیا تھا۔ یہود کی شریعت میں ہفتہ کا روز عبادت کے لیے معین کر دیا گیا تھا اور اس روز دنیاوی کام کاج کی اجازت نہیں تھی۔ آج بھی جو مذہبی یہودی (Practicing Jews) ہیں وہ اس کی پابندی بڑی شدت سے کرتے ہیں۔ لیکن ایک زمانے میں ان کے ایک خاص قبیلے نے ایک شرعی حیلہ ایجاد کر کے اس قانون کی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔ اس واقعہ کی تفصیل سورۃ الاعراف میں آئے گی۔

﴿فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ﴾ ''تو ہم نے کہہ دیا اُن سے کہ ہو جاؤ ذلیل بندر۔''

ان کی شکلیں مسخ کر کے انہیں بندروں کی صورت میں تبدیل کر دیا گیا۔ تین دن کے بعد یہ سب مر گئے۔

آیت ۶۶ ﴿فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا﴾ ''پھر ہم نے اس (واقعہ کو یا اس بستی) کو عبرت کا سامان بنا دیا ان کے لیے بھی جو سامنے موجود تھے (اس زمانے کے لوگ) اور ان کے لیے بھی جو بعد میں آنے والے تھے''

﴿وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ ''اور ایک نصیحت (اور سبق آموزی کی بات) بنا دیا اہلِ تقویٰ کے لیے۔''

آیات ۶۷ تا ۷۴

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ﴾ قَالُوا ادْعُ

لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْئٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْىِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

ان آیات کے مطالعے سے قبل ان کا پس منظر جان لیجیے۔ بنی اسرائیل میں عامیل نامی ایک شخص قتل ہو گیا تھا اور قاتل کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے حکم دیا کہ ایک گائے ذبح کرو اور اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا مُردہ شخص کے جسم پر مارو تو وہ جی اُٹھے گا اور بتا دے گا کہ میرا قاتل کون ہے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ میں ہمیں معجزات کا عمل دخل بہت زیادہ ملتا ہے۔ یہ بھی انہی معجزات میں سے ایک معجزہ تھا۔ گائے کو ذبح کرانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ بنی اسرائیل کے قلوب و اذہان میں گائے کا جو تقدس راسخ ہو چکا تھا اُس پر تلوار چلائی جائے۔ اور پھر انہیں یہ بھی دکھا دیا گیا کہ ایک مُردہ آدمی زندہ بھی ہو سکتا ہے اس طرح بعث بعد الموت کا ایک نقشہ انہیں اس دنیا میں دکھا دیا گیا۔ بنی اسرائیل کو جب گائے ذبح کرنے کا حکم ملا تو ان کے دلوں میں جو بچھڑے کی محبت اور گائے کی تقدیس جڑ پکڑ چکی تھی اس کے باعث انہوں نے اس حکم سے کسی طرح سے بچ نکلنے کے لیے مین میخ نکالنی شروع کی اور طرح طرح کے سوال کرنے

لگے کہ وہ کیسی گائے ہو؟ اس کا کیا رنگ ہو؟ کس طرح کی ہو؟ کس عمر کی ہو؟ بالآخر جب ہر طرف سے اُن کا گھیراؤ ہو گیا اور سب چیزیں ان کے سامنے واضح کر دی گئیں تب انہوں نے چار و ناچار بادلِ نخواستہ اس حکم پر عمل کیا۔ اب ہم ان آیات کا ایک رواں ترجمہ کر لیتے ہیں۔

آیت ۶۷ ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً﴾ ''اور یاد کرو جب موسیٰؑ نے کہا اپنی قوم سے کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے کو ذبح کرو۔''

﴿قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا﴾ ''انہوں نے کہا کیا آپؑ ہم سے کچھ ٹھٹھا کر رہے ہیں؟'' کیا آپؑ یہ بات ہنسی مذاق میں کہہ رہے ہیں؟

﴿قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ﴾ ''فرمایا میں اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں اس سے کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔''

ہنسی مذاق اور تمسخر و استہزاء تو جاہلوں کا کام ہے اور اللہ کے نبی سے یہ بعید ہے کہ وہ دین کے معاملات کے اندر ان چیزوں کو شامل کر لے۔

آیت ۶۸ ﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ﴾ ''انہوں نے کہا (اچھا ایسی ہی بات ہے تو) ہمارے لیے ذرا اپنے ربّ سے دعا کیجیے کہ وہ ہم پر واضح کر دے کہ وہ کیسی ہو۔''

﴿قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ﴾ ''حضرت موسیٰؑ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ ایک ایسی گائے ہونی چاہیے جو نہ بوڑھی ہو نہ بالکل بچھیا۔''

﴿عَوَانٌۢ بَیْنَ ذٰلِكَ﴾ ''بڑھاپے اور نوجوانی کے بین بین ہو۔''

﴿فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ﴾ ''تو اب کر گزرو جو تمہیں حکم دیا جا رہا ہے۔''

آیت ۶۹ ﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا﴾ ''اب انہوں نے کہا (ذرا ایک دفعہ پھر) ہمارے لیے دعا کیجیے اپنے ربّ سے کہ وہ ہمیں بتا دے کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔''

﴿قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ﴾ ''فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ گائے ہونی چاہیے زرد رنگ کی، جس کا رنگ ایسا شوخ ہو کہ دیکھنے والوں کو خوب اچھی لگے۔''

یہ خوبیاں اُس گائے کی تھیں جو اُن کے ہاں زیادہ سے زیادہ مقدس سمجھی جاتی تھی۔ اگر

پہلے ہی حکم پر وہ عمل پیرا ہو جاتے تو کسی بھی گائے کو ذبح کر سکتے تھے۔ لیکن یکے بعد دیگرے سوالات کے باعث رفتہ رفتہ اُن کا گھیراؤ ہوتا گیا کہ جس گائے کے تقدس کا تأثر ان کے ذہن میں زیادہ سے زیادہ تھا اُسی کو focus کر دیا گیا۔

آیت ۷۰ ﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ﴾ ''انہوں نے کہا (ذرا پھر) اللہ سے ہمارے لیے دعا کیجیے کہ وہ ہم پر واضح کر دے کہ وہ گائے کیسی ہو''

﴿إِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا﴾ ''کیونکہ گائے کا معاملہ یقیناً ہم پر کچھ مشتبہ ہو گیا ہے۔'' ہمیں گائے کی تعیین میں اشتباہ ہو گیا ہے۔

﴿وَإِنَّآ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۝﴾ ''اور اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور راہ پالیں گے۔''

آیت ۷۱ ﴿قَالَ إِنَّهٗ يَقُوْلُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ﴾ ''فرمایا کہ اللہ فرماتا ہے وہ ایک ایسی گائے ہونی چاہیے کہ جس سے کوئی مشقت نہ لی جاتی ہو' نہ وہ زمین میں ہل چلاتی ہو اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہو۔''

﴿مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا﴾ ''وہ صحیح سالم یک رنگ ہونی چاہیے' اُس میں (کسی دوسرے رنگ کا) کوئی داغ تک نہ ہو۔''

﴿قَالُوا الْئٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ﴾ ''انہوں نے کہا اب آپ لائے ہیں ٹھیک بات۔'' اب تو آپؑ نے بات پوری طرح واضح کر دی ہے۔

﴿فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝﴾ ''تب انہوں نے اُس کو ذبح کیا اور وہ لگتے نہ تھے کہ ایسا کر لیں گے۔''

اب وہ کیا کرتے' پے بہ پے سوالات کرتے کرتے وہ گھیراؤ میں آ چکے تھے' لہٰذا بادلِ نخواستہ وہ اپنی مقدس سنہری گائے کو ذبح کرنے پر مجبور ہو گئے۔

یہاں واقعہ کی ترتیب تورات سے مختلف ہے اور ذبح بقرہ کا جو سبب تھا وہ بعد میں بیان ہو رہا ہے' جبکہ تورات میں ترتیب دوسری ہے۔

آیت ۷۲ ﴿وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا﴾ ''اور یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا' اور اُس کا الزام تم ایک دوسرے پر لگا رہے تھے۔'' چنانچہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ قاتل کون ہے۔

﴿وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴾ ''اور اللہ کو ظاہر کرنا تھا جو کچھ تم چھپاتے تھے۔''

اللہ تعالیٰ فیصلہ کر چکا تھا کہ جو کچھ تم چھپا رہے ہو اسے نکال کر رہے گا اور واضح کر دے گا۔

آیت ۳ ﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا﴾ ''تو ہم نے حکم دیا کہ مقتول کی لاش کو اُس گائے کے ایک ٹکڑے سے ضرب لگاؤ۔''

اس طرح وہ مُردہ شخص بحکمِ الٰہی تھوڑی دیر کے لیے زندہ ہو گیا اور اُس نے اپنے قاتل کا نام بتا دیا۔

﴿كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى﴾ ''دیکھو اسی طرح اللہ مُردوں کو زندہ کر دے گا''

﴿وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾ ''اور وہ تمہیں اپنی نشانیاں (اپنی قدرت کے نمونے) دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔''

اب جو الفاظ آگے آ رہے ہیں بہت سخت ہیں۔ لیکن ان کو پڑھتے ہوئے دروں بینی ضرور کیجیے گا' اپنے اندر ضرور جھانکیے گا۔

آیت ۴ ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ ''پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس سب کے بعد''

جب دین میں حیلے بہانے نکالے جانے لگیں اور حیلوں بہانوں سے شریعت کے احکام سے بچنے اور اللہ کو دھوکہ دینے کی کوشش کی جائے تو اُس کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ دل کی سختی ہے۔

﴿فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ ''پس اب تو وہ پتھروں کی مانند ہیں' بلکہ سختی میں ان سے بھی زیادہ شدید ہیں''۔

یہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی قرآن حکیم کا ایک بڑا عمدہ مقام ہے۔

﴿وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ﴾ ''اور پتھروں میں سے تو یقیناً ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے چشمے پھوٹ بہتے ہیں۔''

﴿وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ﴾ ''اور ان (پتھروں اور چٹانوں) میں سے بے شک ایسے بھی ہوتے ہیں جو شق ہو جاتے ہیں اور ان میں سے پانی برآمد ہو جاتا ہے۔''

﴿وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ ''اور ان میں سے یقیناً وہ بھی ہوتے ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔''

(باقی صفحہ 60 پر)

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم
ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان
نظر ثانی: حافظ محمد زبیر

سورۃ البقرۃ (مسلسل)

آیت ۲۱۱

﴿سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کَمْ اٰتَیْنٰھُمْ مِّنْ اٰیَۃٍ بَیِّنَۃٍ وَمَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَۃَ اللّٰہِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْہُ فَاِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝﴾

ترکیب: ''کَمْ'' استفہامیہ ہے۔ ''اٰیَۃٍ بَیِّنَۃٍ'' اس کی تمیز ہے لیکن ''مِنْ'' کی وجہ سے مجرور ہے۔ ''اٰتَیْنَا'' کی ضمیر مفعولی ''ھُمْ'' ''بَنِیْ اِسْرَاءِیْلَ'' کے لیے ہے۔ ''مَنْ'' شرطیہ ہے۔ ''یُبَدِّلْ'' سے ''جَاءَتْہُ'' تک شرط ہے۔ اس کے آگے کا جملہ جواب شرط ہے۔ ''یُبَدِّلْ'' کا فاعل اس کی ''ھُوَ'' کی ضمیر ہے جو ''مَنْ'' کے لیے ہے اور ''نِعْمَۃَ اللّٰہِ'' اس کا مفعول ہے۔ ''جَاءَتْ'' کا فاعل اس کی ''ھِیَ'' کی ضمیر ہے جو ''نِعْمَۃَ اللّٰہِ'' کے لیے ہے اور ''ہٗ'' کی ضمیر مفعولی ''مَنْ'' کے لیے ہے۔

ترجمہ:

سَلْ: آپ پوچھیں	بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ: بنی اسرائیل سے
کَمْ: کتنی	اٰتَیْنٰھُمْ: ہم نے دی ان کو
مِّنْ اٰیَۃٍ بَیِّنَۃٍ: واضح نشانی	وَمَنْ یُّبَدِّلْ: اور جو بدلتا ہے

نِعْمَةَ اللّٰهِ : اللہ کی نعمت کو
مِنْۢ بَعْدِ مَا : اس کے بعد کہ جو
جَآءَتْهُ : وہ آئی اس کے پاس
فَاِنَّ اللّٰهَ : تو یقیناً اللہ
شَدِيْدُ الْعِقَابِ : پکڑنے میں سخت ہے

نوٹ (۱) : قاعدہ یہ ہے کہ ''کَمْ'' کے بعد والا اسم اگر منصوب ہو تو ایسا ''کَمْ'' استفہامیہ ہوتا ہے اور اگر اسم مجرور ہو تو وہ ''کَمْ'' خبریہ ہوتا ہے۔ اب اس کا ایک استثناء سمجھ لیں۔ ''کَمْ'' استفہامیہ اور اس کے اسم کے درمیان میں اگر کوئی دوسرا لفظ آ جائے' جیسا کہ اس آیت میں ''اٰتَيْنٰهُمْ'' آیا ہے' تو اس کے اسم کو ''مِنْ'' لگا کر مجرور کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں بھی وہ ''کَمْ'' استفہامیہ ہی رہتا ہے' خبریہ نہیں ہوتا۔

نوٹ (۲): یہاں ''نِعْمَةَ اللّٰهِ'' سے مراد ''اللہ کا دین'' ہے۔ اور اللہ کے دین کا حامل ہونے میں منصبِ امامت از خود شامل ہے۔ بنی اسرائیل نے اللہ کے دین میں تبدیلیاں کر کر کے اس کو اتنا مسخ کر دیا کہ اس میں صحیح اور غلط کا فرق کرنا ممکن نہ رہا اور دنیا کے لیے اس سے راہنمائی حاصل کرنے کا امکان ختم ہو گیا۔ اس لیے ان کو منصبِ امامت سے معزول کیا گیا۔

آیت ۲۱۲

﴿زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾

زی ن

زَانَ (ض) زَيْنًا : کسی چیز کو خوبصورت بنانا' سجانا' آراستہ کرنا۔

زِيْنَةٌ (اسم ذات) : وہ چیز جس سے کسی چیز کو سجایا جائے' سجاوٹ' آرائش۔ ﴿مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ﴾ (الاعراف:۳۲) ''کس نے حرام کیا اللہ کی اس سجاوٹ کو جو اُس نے نکالی اپنے بندوں کے لیے؟''

زَيَّنَ (تفعیل) تَزْيِيْنًا : بتدریج سجانا' خوب سجانا۔ ﴿وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (الانعام) ''اور خوب سجایا ان کے لیے شیطان نے اس کو جو وہ لوگ کیا کرتے تھے۔'' ﴿لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ (الحُجرات:۷) ''اور لیکن اللہ نے محبوب بنایا تمہارے لیے ایمان کو اور اس نے خوب سجایا اس کو تمہارے دلوں میں۔''

تَزَیَّنَ (تفعّل) تَزَیُّنًا اور اِزَّیُّنًا: بتکلف آراستہ ہونا۔ ﴿اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّیَّنَتْ﴾ (یونس: ۲۴) ''جب پکڑا زمین نے اپنا سنگھار اور وہ آراستہ ہوئی۔''

ترکیب: ''زُیِّنَ'' کا نائب فاعل ''اَلْحَیٰوةُ الدُّنْیَا'' ہے۔ ''اَلْحَیٰوةُ'' مؤنث غیر حقیقی ہے' اس لیے اس کے فعل کے لیے مذکر کا صیغہ بھی جائز ہے۔ ''لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا'' متعلق فعل ہے۔ ''وَیَسْخَرُوْنَ'' کا ''واوَ'' عاطفہ ہے۔ ''یَسْخَرُوْنَ'' کی ''هُمْ'' کی ضمیر فاعلی ''لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا'' کے لیے ہے۔ ''وَالَّذِیْنَ اتَّقَوْا'' کا ''واوَ'' استینافیہ ہے اس لیے اس سے پہلے وقف لازم ہے۔ ''وَالَّذِیْنَ اتَّقَوْا'' مبتدأ ہے' اس کی خبر محذوف ہے اور ظرف ''فَوْقَهُمْ'' قائم مقام خبر ہے۔ اس میں ''هُمْ'' کی ضمیر ''لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا'' کے لیے ہے۔ ''یَوْمَ الْقِیٰمَةِ'' دوسرا ظرف ہے اور متعلق خبر ہے۔ ''یَرْزُقُ'' اور ''یَشَآءُ'' دونوں کا مفعول ''مَنْ'' ہے۔ ''یَشَاءُ'' کی ''هُوَ'' کی ضمیرِ فاعلی اللہ کے لیے ہے۔

ترجمہ:

زُیِّنَ: سجایا گیا	لِلَّذِیْنَ: ان کے لیے جنہوں نے
کَفَرُوْا: ناشکری کی	الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا: دُنیوی زندگی کو
وَیَسْخَرُوْنَ: اور وہ لوگ مذاق کرتے ہیں	مِنَ الَّذِیْنَ: ان سے جو
اٰمَنُوْا: ایمان لائے	وَالَّذِیْنَ: اور وہ لوگ جنہوں نے
اتَّقَوْا: تقویٰ کیا	فَوْقَهُمْ: ان سے بالاتر ہوں گے
یَوْمَ الْقِیٰمَةِ: قیامت کے دن	وَاللّٰهُ: اور اللہ
یَرْزُقُ: عطا کرتا ہے	مَنْ: اس کو جس کو
یَّشَآءُ: وہ چاہتا ہے	بِغَیْرِ حِسَابٍ: کسی شمار کے بغیر

نوٹ (۱): قرآن مجید میں ایک سو سے زیادہ مقامات پر لفظ ''یَشَاءُ'' آیا ہے اور پچاس سے زیادہ مقامات پر اس سے پہلے ''مَنْ'' یا ''لِمَنْ'' آیا ہے۔ ہمارے کچھ عقل پرست لوگ (عقل پسندی قرآنی ہدایات کے مطابق ہے' لیکن عقل پرستی غلط ہے) ایسے مقامات پر ''مَنْ'' کو ''یَشَاءُ'' کا فاعل مان کر ترجمہ کرتے ہیں۔ آیت زیر مطالعہ قرآن مجید کے ان مقامات میں سے ایک ہے جہاں عقل پرستوں کی غلطی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

''مَنْ'' کو اگر ''یَشَاءُ'' کا فاعل مان کر ترجمہ کریں تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیتا ہے جو چاہتا ہے۔ اب اگر ایمان داری سے سوچا جائے تو ہر غیر متعصب ذہن کو تسلیم کرنا

پڑے گا کہ کون ہے جو نہیں چاہتا کہ اس کو بے شمار ملے' اور اس دنیا میں کون ہے جس کو اُس کی خواہش کے مطابق ملا ہے؟ عام آدمی کا تو ذکر ہی چھوڑ دیں' یہ خواہش تو اپنے وقت کے کسی فرعون کی بھی پوری نہیں ہوئی۔

عقل پرستوں کی سوچ میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے چاہنے کو اپنے چاہنے پر قیاس کرتے ہیں' حالانکہ ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بلکہ صحیح تر بات یہ ہے کہ ان میں کسی قسم کا کوئی نسبت و تناسب نہیں ہے۔ ہمارا چاہنا ہمارے محدود علم' محدود سمجھ' بے لگام خواہشات' خاندان' برادری' ذات پات اور رنگ و نسل کے تعصبات کے تحت ہوتا ہے' جبکہ اللہ تعالیٰ کا چاہنا اس کی لامحدود صفات' مثلاً علم' رأفت' رحمت اور حکمت وغیرہ کے مطابق ہوتا ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو سمجھ کر تسلیم کر لیتے ہیں' ان کو قرآن مجید کے مذکورہ مقامات کا وہ مفہوم سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اُمت کو سمجھا گئے ہیں۔

آیت ۲۱۳

﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾

ترکیب: ''كَانَ'' کا اسم ''النَّاسُ'' ہے اور مرکب توصیفی ''أُمَّةً وَّاحِدَةً'' اس کی خبر ہے۔ ''فَبَعَثَ'' کا فاعل ''اللّٰهُ'' ہے۔ ''النَّبِيّٖنَ'' اس کا مفعول ہے' جبکہ ''مُبَشِّرِيْنَ'' اور ''مُنْذِرِيْنَ'' حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔ ''اَنْزَلَ'' میں ''هُوَ'' کی ضمیر فاعلی ''اللّٰهُ'' کے لیے ہے۔ ''مَعَهُمُ'' کی ضمیر ''النَّبِيّٖنَ'' کے لیے ہے' جبکہ ''اَنْزَلَ'' کا مفعول ''الْكِتٰبَ'' ہے۔ ''لِيَحْكُمَ'' میں ''هُوَ'' کی ضمیر فاعلی ''الْكِتٰبَ'' کے لیے ہے۔ ''فِيْهِ'' کی ضمیر ''فِيْمَا'' کی ضمیر عائد ہے۔ ''مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ'' کی ضمیر ''الْكِتٰبَ'' کے لیے ہے۔ ''اُوْتُوْا'' کا نائب فاعل ''الَّذِيْنَ'' ہے اور ''هُ'' کی ضمیر اس کا مفعول ثانی ہے جو کہ ''الْكِتٰبَ'' کے لیے ہے۔ ''بَغْيًا'' حال یا مفعول لہ ہے۔

''هَدٰی ۔ یَهْدِیْ'' کے دو مفعول آتے ہیں۔ مفعولِ اوّل یعنی جس کو ہدایت دی جائے' یہ بنفسہٖ آتا ہے اور مفعولِ ثانی یعنی جس چیز کی ہدایت دی جائے' یہ ''اِلٰی'' یا ''لِ'' کے صلہ کے ساتھ آتا ہے۔ یہاں ''فَهَدَی'' کا فاعل ''اللّٰهُ'' ہے' جبکہ ''الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' اس کا مفعولِ اوّل ہے اور ''لِمَا'' مفعولِ ثانی ہے۔ اسی طرح ''وَاللّٰهُ یَهْدِیْ'' کا مفعولِ اوّل ''مَنْ یَّشَاءُ'' ہے اور ''اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ'' مفعولِ ثانی ہے۔

ترجمہ:

كَانَ النَّاسُ :لوگ تھے	اُمَّةً وَّاحِدَةً :ایک اُمت
فَبَعَثَ :تو بھیجا	اللّٰهُ :اللہ نے
النَّبِیّٖنَ :انبیاء کو	مُبَشِّرِیْنَ : بشارت دینے والے ہوتے ہوئے
وَمُنْذِرِیْنَ: اور خبردار کرنے والے ہوتے ہوئے	وَاَنْزَلَ :اوراس نے اتاری
مَعَهُمُ : ان کے ساتھ	الْكِتٰبَ :کتاب
بِالْحَقِّ : حق کے ساتھ	لِیَحْكُمَ :تاکہ وہ فیصلہ کرے
بَیْنَ النَّاسِ :لوگوں کے مابین	فِیْمَا :اس میں
اخْتَلَفُوْا :انہوں نے اختلاف کیا	فِیْهِ :جس میں
وَمَا اخْتَلَفَ :اوراختلاف نہیں کیا	فِیْهِ :اس میں
اِلَّا الَّذِیْنَ :مگران لوگوں نے جن کو	اُوْتُوْهُ :وہ دی گئی
مِنْۢ بَعْدِ مَا :اس کے بعد کہ جو	جَآءَتْهُمُ :آئیں ان کے پاس
الْبَیِّنٰتُ :کھلی نشانیاں	بَغْیًۢا :سرکشی کرتے ہوئے
بَیْنَهُمْ :آپس میں	فَهَدَی :پھر ہدایت دی
اللّٰهُ :اللہ نے	الَّذِیْنَ :ان لوگوں کو جو
اٰمَنُوْا :ایمان لائے	لِمَا :اس کی
اخْتَلَفُوْا :انہوں نے اختلاف کیا	فِیْهِ :جس میں
مِنَ الْحَقِّ :حق میں سے	بِاِذْنِهٖ :اپنے اِذن سے
وَاللّٰهُ :اوراللہ	یَهْدِیْ :ہدایت دیتا ہے

مَنۡ: اس کو جس کو یَّشَآءُ: وہ چاہتا ہے

اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ: ایک سیدھے راستے کی طرف

نوٹ (۱): اس آیت کے شروع میں آیا ہے کہ پہلے سب لوگ ایک دین پر کاربند تھے۔ اس کے بعد یہ بات محذوف ہے کہ پھر ان میں اختلاف پیدا ہوئے' تب اللہ نے انبیاء کو بھیجا۔ اس بات کی تصدیق آیت کے اگلے حصے ''لِیَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ فِیۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ'' سے ہوتی ہے۔

نوٹ (۲): اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ اختلافِ رائے فِی نفسہٖ کوئی بُری چیز نہیں ہے' البتہ اس میں اگر نیت بَغۡیًۢا بَیۡنَهُمۡ کی ہو تو یہ مذموم اختلاف ہے۔ لیکن حق کی تلاش میں اہلِ ایمان میں اگر اختلافِ رائے ہو جائے تو یہ فطری اختلاف ہے' اور ایسے اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے۔

آیت ۲۱۴

﴿اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا یَاۡتِکُمۡ مَّثَلُ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِکُمۡ ؕ مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا حَتّٰی یَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰی نَصۡرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِیۡبٌ ﴿۲۱۴﴾﴾

ز ل ز ل

زَلۡزَلَ (رُباعی) زِلۡزَالًا: کسی چیز کو بہت زیادہ ہلانا' ہلا مارنا۔ ﴿اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا ﴿۱﴾﴾ (الزلزال) ''جب ہلا یا جائے گا زمین کو جیسا اس کو ہلانے کا حق ہے۔''

زَلۡزَلَةٌ (اسم ذات): سخت جنبش' زلزلہ۔ ﴿اِنَّ زَلۡزَلَةَ السَّاعَةِ شَیۡءٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱﴾﴾ (الحج) ''یقیناً قیامت کا زلزلہ ایک عظیم چیز ہے۔''

ترکیب: ''اَمۡ'' استفہامیہ ہے۔ ''حَسِبۡتُمۡ'' کا فاعل اس کی ضمیر فاعلی ''اَنۡتُمۡ'' ہے' اس کا مفعولِ اوّل محذوف ہے جو کہ ''سَهۡلًا'' ہو سکتا ہے' جبکہ ''اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ'' مفعولِ ثانی ہے۔ ''وَلَمَّا'' کا ''واوَ'' حالیہ ہے۔ ''لَمَّا'' نے ''یَاۡتِیۡ'' کو مجزوم کیا تو ''یا'' گر گئی اس لیے ''یَاۡتِ'' آیا ہے۔ ''کُمۡ'' اس کا مفعول ہے اور ''مَثَلُ الَّذِیۡنَ'' اس کا فاعل ہے۔ ''مَسَّتۡ'' کا مفعول ''هُمۡ'' ہے جو ''الَّذِیۡنَ'' کے لیے ہے' جبکہ ''الۡبَاۡسَآءُ'' اور ''الضَّرَّآءُ'' اس کے فاعل ہیں۔ ''زُلۡزِلُوۡا'' کا نائب فاعل اس کی ''هُمۡ'' کی ضمیر ہے جو

''اَلَّذِیْنَ'' کے لیے ہے۔ ''مَعَهٗ'' کی ضمیر ''اَلرَّسُوْلُ'' کے لیے ہے۔ ''مَتٰی'' مبتدأ ہے اور ''نَصْرُ اللّٰهِ'' اس کی خبر ہے۔

ترجمہ:

اَمْ حَسِبْتُمْ : کیا تم لوگوں نے گمان	اَنْ تَدْخُلُوا : کہ تم لوگ داخل ہو جاؤ گے
	کیا
الْجَنَّةَ : جنت میں	وَ : حالانکہ
لَمَّا یَاْتِكُمْ : ابھی تک نہیں پہنچے تم کو	مَثَلُ الَّذِیْنَ : اُن کی مانند جو
خَلَوْا : گزرے	مِنْ قَبْلِكُمْ : تم سے پہلے
مَسَّتْهُمُ : پہنچیں ان کو	الْبَاْسَآءُ : سختیاں
وَالضَّرَّآءُ : اور تکالیف	وَزُلْزِلُوْا : اور وہ لوگ ہلا مارے گئے
حَتّٰی : یہاں تک کہ	یَقُوْلَ : کہنے لگے
الرَّسُوْلُ : (وقت کے) رسول	وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا : اور وہ لوگ جو ایمان لائے
مَعَهٗ : اُن کے ساتھ	مَتٰی : کب
نَصْرُ اللّٰهِ : اللہ کی مدد ہے	اَلَآ : سن لو
اِنَّ : یقیناً	نَصْرَ اللّٰهِ : اللہ کی مدد
قَرِیْبٌ : قریب ہے	

نوٹ (۱) : آزمائش کی ضرورت اور حکمت پر سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۵۵ کے نوٹ ۲ میں بات ہو چکی ہے۔

آیت ۲۱۵

﴿یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ۝﴾

ترکیب : ''یَسْئَلُوْنَ'' کا فاعل اس کی ضمیر ''هُمْ'' ہے جو صحابۂ کرامؓ کے لیے ہے۔ ''كَ'' اس کی ضمیر مفعولی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے لیے ہے۔ ''مَاذَا'' اسمِ استفہام ہے اور کیا کچھ اور کتنا کے معنی میں آتا ہے۔ ''مَا اَنْفَقْتُمْ'' کا ''ما'' شرطیہ ہے۔ ''اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَیْرٍ''

شرط ہے اور ''فَلِلْوَالِدَیْنِ'' سے ''وَابْنِ السَّبِیْلِ'' تک جواب شرط ہے۔ ''مِنْ خَیْرٍ'' کا ''مِنْ'' بیانیہ بھی ہو سکتا ہے اور تبعیضیہ بھی اور ''اَنْفَقْتُمْ'' کا مفعول ہونے کی وجہ سے ''خَیْرٍ'' کا ترجمہ مال ہو گا۔ ''فَلِلْوَالِدَیْنِ'' سے پہلے اس کا مبتدأ ''ھُوَ'' اور خبر دونوں محذوف ہیں۔ اس کے حرف جر ''لِ'' پر عطف ہونے کی وجہ سے ''وَالْاَقْرَبِیْنَ'' سے ''وَابْنِ السَّبِیْلِ'' تک الفاظ مجرور ہیں' اور یہ سب محذوف متعلق خبر ہیں۔ ''ابْنِ السَّبِیْلِ'' واحد اور جمع دونوں کے لیے آتا ہے اور یہاں جمع کے معنی میں ہے۔

''مَا تَفْعَلُوْا'' کا ''مَا'' بھی شرطیہ ہے اس لیے ''تَفْعَلُوْنَ'' کا نونِ اعرابی گرا ہوا ہے۔ ''تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ'' شرط ہے اور ''فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ'' جواب شرط ہے۔ ''مِنْ خَیْرٍ'' کا ''مِنْ'' تبعیضیہ بھی ہو سکتا ہے اور بیانیہ بھی اور ''تَفْعَلُوْا'' کا مفعول ہونے کی وجہ سے ''خَیْرٍ'' کا ترجمہ بھلائی ہو گا۔

''عَلِمَ یَعْلَمُ'' کا مفعول بنفسہٖ آتا ہے۔ یعنی ''عَلِمَ بِہٖ'' نہیں کہتے بلکہ ''عَلِمَہٗ'' کہتے ہیں۔ لیکن افعل تفضیل ''اَعْلَمُ'' اور ''عَلِیْمٌ'' کے ساتھ ''بِ'' کا صلہ آتا ہے' جیسے اس آیت میں ''بِہٖ عَلِیْمٌ'' آیا ہے۔

ترجمہ:

یَسْئَلُوْنَکَ : وہ لوگ پوچھتے ہیں آپؐ سے کہ	مَاذَا : کتنا
یُنْفِقُوْنَ : وہ لوگ خرچ کریں	قُلْ : (آپؐ) کہہ دیجیے کہ
مَآ : جو	اَنْفَقْتُمْ : تم لوگ خرچ کرو گے
مِّنْ خَیْرٍ : جتنا بھی مال	فَلِلْوَالِدَیْنِ : تو وہ ہے والدین کے لیے
وَالْاَقْرَبِیْنَ : اور قرابت داروں کے لیے	وَالْیَتٰمٰی : اور یتیموں کے لیے
وَالْمَسٰکِیْنِ : اور مسکینوں کے لیے	وَابْنِ السَّبِیْلِ : اور مسافروں کے لیے
وَمَا : اور جو	تَفْعَلُوْا : تم لوگ کرو گے
مِنْ خَیْرٍ : کسی قسم کی کوئی بھلائی	فَاِنَّ اللّٰہَ : تو یقیناً اللہ
بِہٖ : اس کو	عَلِیْمٌ : ہر حال میں جاننے والا ہے

نوٹ (۱) : آگے آیت ۲۱۹ میں یہی سوال پھر آ رہا ہے۔ البتہ وہاں پر جواب مختلف ہے۔ وہیں پر دونوں کی کچھ وضاحت کی جائے گی۔

آیت ۲۱۶

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢١٦﴾﴾

ك ر ہ

كَرُهَ (ک) كَرَاهَةً : بدنما ہونا' بُرا ہونا۔

كَرِهَ (س) كَرْهًا اور كُرْهًا : کسی چیز کو برا سمجھنا' ناپسند کرنا۔ ﴿وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٨٢﴾﴾ (یونس) ''اور حق کرتا ہے اللہ حق کو اپنے فرمانوں سے اور اگر (یعنی خواہ) ناپسند کریں مجرم لوگ۔''

كُرْهٌ : مصدر کے علاوہ صفت بھی ہے: ناپسندیدہ' آیت زیرِ مطالعہ۔

كَارِهٌ (فَاعِلٌ کے وزن پر اسم الفاعل) : ناپسند کرنے والا۔ ﴿وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿٧٠﴾﴾ (المؤمنون) ''اور ان کے اکثر حق کو ناپسند کرنے والے ہیں۔''

مَكْرُوْهٌ (مَفْعُوْلٌ کے وزن پر صفت) : ناپسند کیا ہوا' یعنی ناپسندیدہ۔ ﴿كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿٣٨﴾﴾ (بنی اسراءیل) ''یہ سب' اس کی برائی' تیرے ربّ کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔''

اَكْرَهَ (افعال) اِكْرَاهًا : ناپسندیدہ کام پر مجبور کرنا' زبردستی کرنا۔ ﴿اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٩٩﴾﴾ (یونس) ''تو کیا آپؐ مجبور کریں گے لوگوں کو یہاں تک کہ وہ ہو جائیں مؤمن؟''

كَرَّهَ (تفعیل) تَكْرِيْهًا : کسی کے لیے کسی چیز کو ناپسندیدہ بنا دینا۔ ﴿وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ۭ﴾ (الحُجرات:۷) ''اور اس نے ناگوار کر دیا تمہارے لیے کفر کو اور فسق کو اور نافرمانی کو۔''

ش ر ر

شَرَّ (ن۔ض) شَرًّا : فسادی ہونا' نقصان دہ ہونا' بُرا ہونا۔

شَرٌّ ج اَشْرَارٌ (اسم ذات بھی ہے): فساد، برائی۔ آیت زیر مطالعہ۔ ﴿مَالَنَا لَا نَرٰی رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ ۝﴾ (ص) ''ہمیں کیا ہوا کہ ہم نہیں دیکھتے ان لوگوں کو جنہیں ہم شمار کیا کرتے تھے بروں میں سے۔''

شَرَرٌ (اسم جنس) واحد شَرَرَةٌ اور شَرَارَةٌ: آگ کی اڑنے والی چنگاریاں۔ ﴿اِنَّهَا تَرْمِیْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ۝﴾ (المرسلت) ''بیشک وہ پھینکتی ہے چنگاریاں جیسے محل۔''

ترکیب: ''كُتِبَ'' کا نائب فاعل ''اَلْقِتَالُ'' ہے۔ ''هُوَ'' مبتدأ ہے اور یہ ''اَلْقِتَالُ'' کے لیے ہے، جبکہ ''كُرْهٌ'' اس کی خبر ہے۔ ''عَسٰی'' فعل مقاربہ ہے، اس کا اسم محذوف ہے اور جملہ فعلیہ ''اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا'' اس کی خبر ہے۔ ''تَكْرَهُوْا'' کا مفعول ''شَيْئًا'' ہے۔ ''وَهُوَ خَيْرٌ'' کا ''واؤ'' حالیہ ہے اور ''هُوَ'' کی ضمیر ''شَيْئًا'' کے لیے ہے۔

ترجمہ:

كُتِبَ: فرض کیا گیا	عَلَيْكُمُ: تم لوگوں پر
اَلْقِتَالُ: جنگ کرنا	وَهُوَ: اور وہ
كُرْهٌ: ناگوار ہے	لَّكُمْ: تمہارے لیے
وَعَسٰٓى: اور ہوسکتا ہے	اَنْ: کہ
تَكْرَهُوْا: تم لوگ ناپسند کرو	شَيْئًا: کسی چیز کو
وَّ: اس حال میں کہ	هُوَ: وہ
خَيْرٌ: بھلائی ہے	لَّكُمْ: تمہارے لیے
وَعَسٰٓى: اور ہوسکتا ہے	اَنْ: کہ
تُحِبُّوْا: تم لوگ محبت کرو	شَيْئًا: کسی چیز سے
وَّ: اس حال میں کہ	هُوَ: وہ
شَرٌّ: برائی ہے	لَّكُمْ: تمہارے لیے
وَاللّٰهُ: اور اللہ	يَعْلَمُ: جانتا ہے
وَاَنْتُمْ: اور تم لوگ	لَا تَعْلَمُوْنَ: نہیں جانتے۔

نوٹ (۱): عربی کے افعالِ مقاربہ میں سے دو افعال قرآن مجید میں استعمال ہوئے ہیں۔ پہلا فعل مقاربہ ''كَادَ، يَكَادُ'' سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۰ کے نوٹ ۱ میں زیر بحث آ چکا ہے۔ دوسرا فعل مقاربہ ''عَسٰی'' (اُمید ہے، ہوسکتا ہے) اس آیت زیر مطالعہ میں آیا ہے۔

اب آپ ان کے قواعد سمجھ لیں' کیونکہ یہ ''آسان عربی گرامر'' میں نہیں پڑھائے گئے۔

۱) افعالِ ناقصہ کی طرح افعالِ مقاربہ بھی کسی جملہ اسمیہ پر داخل ہوتے ہیں' جن کا مبتدا ان کا اسم کہلاتا ہے اور حالتِ رفعی میں رہتا ہے' جبکہ ان کی خبر حالتِ نصبی میں ہوتی ہے۔

۲) افعالِ ناقصہ اور افعالِ مقاربہ میں فرق یہ ہے کہ افعالِ مقاربہ کی خبر کی جگہ ہمیشہ کوئی فعل مضارع آتا ہے جو اپنی ضمیر فاعلی کے ساتھ مل کر جملہ فعلیہ بن کر فعل مقاربہ کی خبر بنتا ہے اور محلاً حالتِ نصبی میں سمجھا جاتا ہے۔ جیسے ﴿عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ﴾ (الاعراف:۱۲۹)۔ اس میں ''عَسٰی'' کا اسم ''رَبُّكُمْ'' ہے اس لیے اس کے مضاف پر رفع آئی ہے۔ ''اَنْ يُّهْلِكَ'' فعل مضارع اور ''عَدُوَّكُمْ'' اس کا مفعول ہے' یہ جملہ فعلیہ ''عسٰی'' کی خبر ہے اور محلاً حالتِ نصبی میں ہے۔

۳) افعالِ مقاربہ کے بعد جو فعل مضارع آتا ہے اس پر ''اَنْ'' لگانا جائز ہے' البتہ ضروری نہیں ہے۔ لیکن ''عَسٰی'' کے بعد اس کو لگانا بہتر ہے' جبکہ ''کَادَ'' کے بعد نہ لگانا بہتر ہے۔

۴) ''عَسٰی'' کے اسم کو محذوف بھی کیا جا سکتا ہے' جیسا کہ آیت زیر مطالعہ میں ہے' اور اس کے اسم کو فعل مضارع کے بعد بھی لا سکتے ہیں' جیسے ﴿عَسٰی اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ (بنی اسرائیل)۔ اس میں ''اَنْ يَّبْعَثَ'' فعل مضارع اور ''كَ'' اس کی ضمیر مفعولی ہے' جبکہ ''عَسٰی'' کا اسم ''رَبُّكَ'' ہے جو فعل کے بعد آیا ہے۔ لیکن یہ صورتیں ''کَادَ'' کے ساتھ جائز نہیں ہیں۔

۵) ''کَادَ'' (ماضی) اور ''یَکَادُ'' (مضارع) دونوں کے صیغے استعمال ہوتے ہیں' لیکن ''عَسٰی'' کے صرف ماضی کے صیغے مستعمل ہیں۔

۶) ''شَرَعَ' طَفِقَ' جَعَلَ' قَامَ اور ''اَخَذَ'' افعالِ مقاربہ نہیں ہیں' لیکن کبھی کبھی یہ افعالِ مقاربہ کی طرح استعمال ہوتے ہیں۔ اس وقت ان کے فعل مضارع کے ساتھ ''اَنْ'' نہیں آتا اور ایسی صورت میں ان سب کے معنی ہوتے ہیں ''مذکورہ کام شروع کرنا یا کرنے لگنا''۔ جیسے ''اَخَذَ الطِّفْلُ يَمْشِيْ''۔ یہاں اگر ''اَخَذَ'' کو فعل اصلی مانیں تو اس جملے کا مطلب ہوگا ''بچے نے پکڑا وہ چلتا ہے''۔ یہ بات مبہم ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ یہاں ''اَخَذَ'' فعل مقاربہ کی طرح آیا ہے اور اس جملے کا مطلب ہے ''بچے نے چلنا شروع کیا یا چلنے لگا''۔

نوٹ (۲): ہم میں سے ہر شخص کو blessing in disguise (برائی کے بھیس میں بھلائی) کا تجربہ ہے' لیکن یہ تجربہ کبھی کبھار ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کبھی کسی برائی میں پوشیدہ بھلائی ذرا جلدی سامنے آ جاتی ہے تو ہمارا ذہن ان کے مابین ربط کو پہچاننے میں کامیاب ہو جاتا ہے' اور ہم کہتے ہیں کہ یہ وہ بھلائی ہے جو فلاں برائی کے بھیس میں میرے پاس آئی تھی۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پوشیدہ بھلائی کا ظہور اتنے وقفہ کے بعد ہوتا ہے کہ ہم اس کے ربط کو پہچان نہیں پاتے۔ جو لوگ اس پہلو سے اپنے حالات پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں وہ اس نوعیت کے روابط کو دوسروں سے زیادہ پہچان لیتے ہیں اور اس حقیقت پر ان کا ایمان اتنا پختہ ہوتا ہے جتنا کہ ہونا چاہیے۔

اس آیت کی راہنمائی میں صحیح طرزِ فکر یہ ہے کہ جب ہماری کسی کوشش اور جدوجہد کا نتیجہ ہماری توقع کے مطابق نہ نکلے تو ہمیں یقین کر لینا چاہیے کہ یہ مِن جانب اللہ ہے' کیونکہ اُس کی اجازت کے بغیر کوئی پتہ بھی جنبش نہیں کر سکتا۔ پھر ہمیں خود کو یاد دلانا چاہیے کہ اللہ ہمارا ربّ ہے اور وہ ہم سے بڑھ کر ہمارا خیر خواہ ہے' اس کے ہاتھ میں خیر ہے اور وہ اِس پر قادر ہے کہ وہ رات میں سے دن کو نکال لائے' اس لیے یقیناً اس میں ہمارے لیے کوئی خیر ہے جو ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے' لیکن وہ اس وقت یقیناً ظاہر ہو گی جب اس کا ظاہر ہونا ہمارے حق میں مفید ہو گا۔

سوچ کا یہ انداز ایسے حقائق پر مبنی ہے جو پوری طرح ہمارے ذہن کی گرفت میں نہیں آتے' لیکن ایک انسان سچے یقین کے ساتھ اگر سوچ کا یہ انداز اختیار کر لے تو اس کی نفسیاتی صحت کے لیے یہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ایک ٹانک ہے جو اُسے بے شمار نفسیاتی بیماریوں (psychological disorders) سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہ اس کی نقد بھلائی ہے۔ اور پوشیدہ بھلائی کا ظہور تو اپنے وقت پر ہو گا ہی' خواہ ہم اس کے ربط کو پہچانیں یا نہ پہچانیں۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کے مکمل دورۂ ترجمہ قرآن اور دروس و خطابات کے علاوہ تلاوتِ قرآن' کتب احادیث کے تراجم' میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے' اردو و انگریزی کتب' کیسٹس' سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست ہماری ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے!

مشرکوں کی محرومیاں

آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں

انتخاب و ترتیب: حافظ محمد سلیمان

۱) مشرکوں کے لیے استغفار کرنا منع ہے

مشرک اتنے بد بخت ہیں کہ رحمۃ للعالمین ﷺ اور مؤمنوں کو اس بات سے منع کر دیا گیا ہے کہ وہ مشرکوں کے لیے استغفار کریں۔

﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ﴾ (التوبۃ)

''نبی (ﷺ) کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں' زیبا نہیں ہے کہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں' چاہے وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں' جب کہ اُن پر یہ بات کھل چکی ہے کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں۔''

۲) مشرکوں کے تمام اعمال ضائع کر دیے جاتے ہیں

مشرک کتنے ہی (بظاہر) نیک کام کرے اور خواہ وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو' شرک اس کے تمام اعمال ضائع کر دیتا ہے اور اس کے تمام کیے کرائے کو غارت کر دیتا ہے۔

﴿وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ۭ

وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۸۷﴾ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۸﴾ (الانعام)

''یہ تھی ہماری حجت جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم کے مقابلہ میں عطا کی۔ ہم جسے چاہتے ہیں بلند مرتبے عطا کرتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ تمہارا ربّ نہایت دانا' علیم ہے۔ اور ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ جیسی اولاد دی۔ ہم نے ہر ایک کو راہِ راست دکھائی اور (وہی راہِ راست جو) اس سے پہلے نوحؑ کو دکھائی تھی اور اسی کی نسل سے ہم نے داؤدؑ' سلیمانؑ' ایوبؑ' یوسفؑ' موسیٰؑ اور ہارونؑ کو (ہدایت بخشی)۔ اور اس طرح ہم نیکوکاروں کو ان کی نیکی کا بدلہ دیتے ہیں۔ اور (اسی کی اولاد سے) زکریاؑ' یحییٰؑ' عیسیٰؑ اور الیاسؑ کو (راہ یاب کیا)۔ ہر ایک ان میں سے صالح تھا۔ اور (اسی کے خاندان سے) اسماعیلؑ' الیسعؑ' یونسؑ اور لوطؑ کو (راستہ دکھایا)۔ اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے تمام دنیا والوں پر فضیلت عطا کی۔ نیز ان کے آباء واجداد اور ان کی اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بہتوں کو ہم نے نوازا' اور انہیں اپنی خدمت کے لیے چن لیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی رہنمائی کی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جس کے ساتھ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اگر کہیں ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا تو ان سب کا کیا کرایا غارت ہو جاتا۔''

﴿مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾﴾ (التوبۃ)

''مشرکین کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں کے مجاور و خادم بنیں' درانحالیکہ اپنے اوپر وہ خود کفر کی شہادت دے رہے ہیں۔ ان کے تو سارے اعمال ضائع ہو گئے اور جہنم میں انہیں ہمیشہ رہنا ہے''۔

۳) مشرکوں پر جنت حرام ہے

مشرکوں پر جنت حرام ہے اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ وہ ایسے ظالم ہیں جن کا کوئی مددگار نہیں۔

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿٧٢﴾ (المائدۃ)

''یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے' حالانکہ مسیح نے کہا تھا: ''اے بنی اسرائیل! اللہ کی بندگی کرو جو میرا ربّ بھی ہے اور تمہارا ربّ بھی ہے۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔''

۴) روزِ محشر رسول اکرم ﷺ کی شفاعت سے محرومی

ہر نبی کی ایک دعا ہوتی ہے جو ضرور قبول ہوتی ہے۔ ہمارے مہربان' شفیق' غمگسار اور اپنی اُمت کی نجات کی فکر میں ساری ساری رات رو رو کر گزارنے والے رسول اکرم ﷺ نے وہ دعا قیامت کے دن اپنی اُمت کی شفاعت کے لیے مؤخر کر رکھی ہے۔ یہ شفاعت آپؐ کے ہر ایک اُمتی کے لیے ہوگی (یا اللہ! سب کو ان میں شامل کرنا) بشرطیکہ وہ شرک پر نہ مرا ہو۔ (اعاذنا اللہ)

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((لِكُلِّ نَبِيٍّ دَعْوَةٌ مُسْتَجَابَةٌ فَتَعَجَّلَ كُلُّ نَبِيٍّ دَعْوَتَهٗ وَاِنِّيْ اخْتَبَاْتُ دَعْوَتِيْ شَفَاعَةً لِاُمَّتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَهِيَ نَائِلَةٌ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مَنْ مَاتَ مِنْ اُمَّتِيْ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا)) (۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر نبی کی ایک دعا ہوتی ہے جو ضرور قبول ہوتی ہے' تو ہر ایک نبی نے جلدی کر کے وہ دعا مانگ لی (دنیا ہی میں) اور میں نے اپنی دعا کو چھپا کر رکھا ہے قیامت کے دن کے واسطے اپنی اُمت کی شفاعت کے لیے' اور اللہ نے چاہا تو میری شفاعت ہر ایک اُمتی کے لیے ہوگی بشرطیکہ وہ شرک پر نہ مرا ہو۔''

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب اختباء النبی ﷺ دعوۃ الشفاعۃ لامتہ۔

دولت مند کا خسارہ کیا ہے؟

مدرس : پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ لَبِیْ ذَرٍّ قَالَ انْتَهَیْتُ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ وَهُوَ جَالِسٌ فِیْ ظِلِّ الْکَعْبَةِ فَلَمَّا رَآنِیْ قَالَ :((هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ وَرَبِّ الْکَعْبَةِ)) فَقُلْتُ : فِدَاکَ اَبِیْ وَاُمِّیْ مَنْ هُمْ؟ قَالَ: ((هُمُ الْاَکْثَرُوْنَ اَمْوَالًا اِلَّا مَنْ قَالَ هٰکَذَا وَهٰکَذَا وَهٰکَذَا مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ وَعَنْ یَمِیْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ وَقَلِیْلٌ مَّا هُمْ)) (متفق علیہ) ☆

''حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ اُس وقت کعبہ کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے جب مجھے دیکھا تو فرمایا: ''ربِّ کعبہ کی قسم! وہ لوگ سب سے زیادہ خسارے میں ہیں''۔ میں نے عرض کیا: میرے ماں باپ آپؐ پر قربان! کون لوگ ہیں جو بڑے خسارے میں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ لوگ جو بڑے دولت مند اور سرمایہ دار ہیں۔ ان میں سے وہی لوگ خسارے سے محفوظ ہیں جو اپنے آگے پیچھے اور دائیں بائیں (ہر طرف خیر کے مصارف میں) اپنی دولت کشادہ دستی کے ساتھ صرف کرتے ہیں' مگر دولت مندوں اور سرمایہ داروں میں ایسے بندے بہت کم ہیں''۔

مال وزر میں بڑی کشش ہے' کیونکہ اس کے ساتھ دنیا کی خوشحالی وابستہ ہے۔ مال دار آدمی دولت خرچ کر کے آرام و آسائش کی تمام چیزیں اکٹھی کر سکتا ہے۔ اچھے مکان میں جملہ سہولیات کے ساتھ باوقار زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اس کے کھانے کی میز پر طرح طرح کے خوش ذائقہ کھانے موجود ہوتے ہیں۔ وہ اعلیٰ درجہ کے ہوٹلوں میں جا کر مرغن اور مسالے دار غذاؤں سے کام و دہن کی تسکین کر سکتا ہے۔ اسے ہر طرح کے موسمی پھل کھانے کو ملتے

☆ صحیح البخاری' کتاب الایمان والنذور' باب کیف کانت یمین النبی ﷺ۔ وصحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' باب تغلیظ عقوبۃ من لا یؤ دّی الزکاۃ۔

ہیں۔ دولت مند آدمی مال و دولت کے بل بوتے پر نوکر چاکر رکھ سکتا ہے جو اُس کے اشاروں پر کام کرتے اور اسے آسودگی فراہم کرتے ہیں۔ مال و زر کی کثرت کی وجہ سے دوسرے لوگ اُس کا احترام کرتے ہیں۔ وہ اپنے بیوی بچوں کی ہر خواہش پوری کر سکتا ہے۔ بیوی کے لیے زرق برق لباس اور قیمتی زیورات خرید سکتا ہے۔ بچوں کے لیے قیمتی کھلونے اور طرح طرح کی پسندیدہ چیزیں فراہم کر سکتا ہے۔ وہ اپنے بچوں کو انگلش سکولوں میں تعلیم دلوا کر اُن کے شاندار مستقبل کا انتظام کر سکتا ہے۔ دولت مند آدمی اپنے بچوں کی شادیوں پر بے دریغ روپیہ خرچ کر کے معاشرے میں اپنی بڑائی قائم کرتا اور اپنی اَنا کی تسکین کا سامان پیدا کر سکتا ہے۔

اس کے برعکس غریب آدمی سادہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ وہ بمشکل اپنی بنیادی ضروریات ہی پوری کر پاتا ہے۔ بیوی بچوں کے تقاضے پورے کرنا اُس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اُس کی زندگی مشقت سے پُر ہوتی ہے۔ اسے روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ اسے اچھا کھانا اور کپڑا میسر نہیں ہوتا۔ یوں اس کی زندگی تلخ ہوتی ہے اور معاشرے میں اسے کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ نادار اور غریب اگر تنگی ترشی میں زندگی گزارتا ہے اور اس حال میں وہ صبر سے کام لیتے ہوئے صرف اللہ کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے' اُس کے ذکر میں مشغول رہتا ہے تو اُس سے زیادہ کامیاب انسان کوئی دوسرا نہیں۔ ایسے شخص کا حساب قیامت کے دن آسان ہوگا۔ اس کے برعکس دولت مند آدمی دنیا میں دولت کے بل بوتے پر عیش و عشرت تو کر لے گا' لیکن حساب کتاب کے وقت اُسے مشکل پیش آئے گی' اس سے جواب دہی ہوگی کہ دولت کا ناجائز استعمال کیوں کیا؟ زیر بحث حدیثِ نبویؐ میں ایسے ہی دولت مندوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے قسم کھا کر کہا کہ وہ سب سے زیادہ گھاٹے میں ہیں۔

اگر دولت سلیقے کے ساتھ استعمال کی جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا انعام ہے۔ مال و دولت فی نفسہٖ بری چیز نہیں۔ روپے پیسے کو قرآن مجید میں فضل کہا گیا ہے اور یہ لفظ کسی طور پر بھی منفی مفہوم نہیں دیتا۔ جس طرح اللہ کی دی ہوئی دیگر نعمتوں مثلاً آنکھ' کان' زبان وغیرہ کا استعمال مالک کی رضا کے مطابق کرنا چاہیے اسی طرح دولت کے خرچ کرنے میں بھی اللہ کے حکموں کی پابندی ضروری ہے۔ البتہ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ اس میں بڑی استقامت' صبر اور استقلال کی ضرورت ہے۔ اکثر دولت مند دولت کے خرچ میں میانہ روی اختیار نہیں کر سکتے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے ہی لوگوں کو سب سے زیادہ خسارہ پانے والے کہا ہے اور یہ

بھی فرمایا ہے کہ ایسے لوگ بہت زیادہ ہیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ: ''وہ دولت مند اس خسارے سے محفوظ ہیں جو اپنی دولت کو فراخ دلی کے ساتھ خیر کے کاموں میں صرف کرتے ہیں''۔ ایسے لوگ نہ صرف خسارے سے بچے ہوئے ہیں' بلکہ ان کے لیے بھلائیاں کمانے کے کثیر مواقع موجود ہیں۔ یہ دولت مند اگر غریبوں کو کھانا کھلائیں' مریضوں کے علاج میں روپیہ خرچ کریں' یتیموں' مسکینوں اور بیواؤں کی خبر گیری کریں' حج اور عمرے کے لیے حرم شریف جا کر وہاں ایک ایک نماز کے بدلے ایک ایک لاکھ نمازوں کا ثواب پائیں' مال کو نام ونمود اور نمائش کے لیے خرچ نہ کریں' فضول خرچی سے بچتے رہیں' اپنی ضروریات کو گھٹاتے رہیں' بیوی بچوں کے ناجائز تقاضوں کو پورا کرنے سے رُکے رہیں اور دولت مندی انہیں غرور اور تکبر میں مبتلا نہ کرے' تو ایسے ہی لوگوں کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ یہ لوگ خسارے سے بچے ہوئے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ بہت کم تعداد میں ہیں۔ کیونکہ دولت کی فراوانی نفسانی خواہشات کو طول دیتی ہے۔ دولت مند آدمی اس دنیا کے آرام و خوش حالی میں اس قدر مدہوش ہو جاتا ہے کہ اسے بُرے بھلے کی تمیز نہیں رہتی۔ اس طرح وہ فکر آخرت سے بے پروا ہو کر محض دولت اکٹھی کرتا اور اسے فضولیات میں اڑاتا رہتا ہے۔ ایسے لوگ موت کے وقت تمنا کریں گے کہ کاش انہیں کچھ مہلت مل جائے تو وہ (اچھے کاموں میں) دولت خرچ کر کے نیکوکاروں میں شامل ہو جائیں گے' مگر اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ﴾ (المنٰفقون:۱۱)

''اور اللہ تعالیٰ ہرگز ڈھیل نہیں دیتا (مزید مہلت نہیں دیتا) کسی شخص کو جب اُس کا وعدہ آ جائے (مہلتِ عمل پوری ہو جائے)''۔

پس اس حدیث سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ دولت بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کا استعمال بُرا بھی ہو سکتا ہے اور اچھا بھی۔ اس کا بُرا استعمال فضول خرچی' عیش وعشرت اور نمود و نمائش ہے اور اچھا استعمال خدا کی رضا کے لیے خرچ کرنا ہے۔ اگرچہ یہ کام مشکل ہے مگر جتنا مشکل ہے اتنا ہی زیادہ ثواب کا موجب اور حقیقی کامیابی و کامرانی اور نجات کا باعث ہے۔ دولت مند لوگوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ وہ اپنی دولت کو کہاں خرچ کر رہے ہیں اور اس کا انجام کیا ہوگا' ابدی خسارہ یا لازوال راحت؟

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔

مدرّسینِ قرآن کے لیے خصوصی ہدایات

قرآن وحدیث کی روشنی میں

حافظ محمد زبیر

پچھلی دو تین دہائیوں سے فہم قرآن کی جو تحریک پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں بالعموم اور شہر لاہور میں بالخصوص جس تیزی سے پھیل رہی ہے وہ واقعتاً ایک بہت ہی مستحسن امر ہے' اور یہ کہنے میں بھی کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ اس تحریک نے ایک بہت بڑے تعلیم یافتہ طبقے کو متأثر کیا ہے اور ہزاروں افراد کی زندگیوں کے رُخ کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ یہ اسی درسِ قرآن اور ترجمۂ قرآن کی کلاسز کے ہی ثمرات ہیں کہ آج ہر طرف فہم قرآن کے ادارے نظر آتے ہیں اور قرآن کے درس وتدریس کا رجحان بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ہم فہم قرآن کی اس تحریک کے حق میں ہیں اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں' لیکن چونکہ اس تحریک کے اکثر افراد نہ تو دینی مدارس کے فارغ طلبہ یا علماء ہیں اور نہ ہی انہوں نے ٹھوس علمی بنیادوں پر دین یعنی قرآن وحدیث کا باقاعدہ علم حاصل کیا ہوتا ہے' اس لیے اپنی کم علمی کی وجہ سے یہ حضرات بعض اوقات لاشعوری طور پر درسِ قرآن کے اصل مقصد سے ہٹ کر ایک ایسی راہ پر چلنا شروع کر دیتے ہیں جس سے خیر کم وجود میں آتا ہے اور فتنہ پیدا ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ ایسے مدرسین' اپنے خلوص کے باوصف' معاشرے کی اصلاح کی بجائے اس میں عدم توازن اور باہمی منافرت کا ایک سبب بن جاتے ہیں۔ اس مضمون میں ہمارے پیش نظر قرآن وحدیث کی روشنی میں مدرسین قرآن کی ان کوتاہیوں کی نشاندہی ہے جو عام طور پر معاشرے میں اصلاح کی بجائے خرابی کا باعث بنتی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ مضمون ایک مدرسِ قرآن کو ایک منہج بھی فراہم کرتا ہے جس پر چل کر وہ اپنے دروس کو عوام الناس کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنا سکتا ہے۔ اس مضمون سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم دروسِ قرآن کے عوامی حلقوں کے خلاف ہیں' بلکہ ان گزارشات سے ہمارا مقصود مدرسینِ قرآن کو صرف یہ حقیقت

باور کرانا ہے کہ ان کی اصل حیثیت مصلحین کی ہے نہ کہ مفسرین کی' اور حلقہ ہائے درسِ قرآنی کا اصل ہدف انذار و تبشیر اور تذکیر ہے نہ کہ تفسیر و تاویل۔ اس ضمن میں قرآن و حدیث پر مبنی چند ہدایات درج ذیل ہیں:

۱) اخلاص

دین اسلام میں ''نیت'' کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ)) (۱)

''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔''

اللہ کے رسول ﷺ کی اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اعمال کی جزا و سزا میں نیت کا عمل دخل بہت زیادہ ہوتا ہے۔ بظاہر ایک عمل لوگوں کے ہاں بہت بڑی نیکی کا کام ہوتا ہے لیکن اللہ کے ہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی' بلکہ بعض اوقات یہ عامل کے لیے عذاب کا باعث بھی بن جاتا ہے' کیونکہ اس میں اخلاص نہیں ہوتا۔ مدرسین کو چاہیے کہ سب سے پہلے اپنے اندر اخلاص پیدا کریں' خالصتاً اللہ کی رضا اور خوشنودی کے حصول کے لیے درسِ قرآن دیں۔ بعض اچھے مدرسین کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ وہ اپنے دروس میں لوگوں کی تعداد کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں' اگر کسی جگہ لوگوں کی تعداد کم ہو تو وہاں درس دینے سے یا تو انکار کر دیتے ہیں یا اکتاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا اخلاص کے منافی ہے۔

حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ ایک جگہ ایک بڑے مجمع سے خطاب کے لیے تشریف لے گئے' تقریباً دو گھنٹے توحید پر درس دیا۔ جب آپ کا درس ختم ہو چکا تو تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھا شخص وہاں پہنچا۔ حضرت شاہ صاحب نے جب اس بوڑھے سے وہاں آنے کا مقصد پوچھا تو اس نے حضرت شاہ صاحب کو بتایا کہ وہ ان کا درس سننے کے لیے آیا تھا۔ حضرت شاہ صاحب اس بوڑھے شخص کے جذبے اور ولولے کو دیکھ کر مکمل درس اس اکیلے بوڑھے کو دوبارہ سنانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس پر وہ بوڑھا حضرت شاہ صاحب سے پوچھنے لگا کیا آپ مجھ اکیلے کے لیے دوبارہ اتنا طویل درس دیں گے؟ تو شاہ صاحب نے اس کو جو جواب دیا وہ واقعتاً سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔ انہوں نے فرمایا:

''پہلے بھی ایک (اللہ تعالیٰ) ہی کو راضی کرنے کے لیے درس دیا تھا اور اب بھی ایک ہی کو راضی کرنا مقصود ہے''۔

جب انسان کے سامنے اصل مقصود اللہ کی رضا ہو تو پھر اس بات کی اہمیت بہت کم رہ جاتی ہے

کہ آپ کا درس سننے کے لیے کتنے افراد تشریف لاتے ہیں۔ ہمارے ہاں کامیاب مدرس اس کو شمار کیا جاتا ہے جس کے درس میں لوگوں کی تعداد زیادہ ہو' جبکہ اللہ کے ہاں کامیاب مدرس وہ ہے جس میں اخلاص زیادہ ہو' چاہے اس کے درس میں شریک ہونے والوں کی تعداد بہت کم ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے مدرسین کو چاہیے کہ وہ شیطان کے وسوسے میں آ کر حاضرین کی تعداد کو اپنے درس کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار نہ بنائیں' بلکہ اپنا اصل مقصود اللہ کی رضا کو بنائیں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے کہ وہ آپ کے اخلاص کی بنیاد پر دیے گئے درس میں شریک فردِ واحد سے ہی دین کی کوئی اتنی بڑی خدمت لے لے جو کہ عدم اخلاص کی بنیاد پر دیے گئے درس میں شریک ہزاروں سامعین کے مجموعی عمل سے کئی گنا زیادہ ہو۔

۲) اِنذار اور فتویٰ کا فرق

بعض مدرسین کے حوالے یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ وہ اپنے دروس میں قرآنی آیات کو جب مختلف افراد' اسلامی جماعتوں اور مسلمان معاشروں پر چسپاں کرتے ہیں تو اُن کا اسلوب ناصحانہ کی بجائے مفتیانہ ہوتا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض مدرسین نفاق' شرک اور کفر سے متعلقہ آیات کا درس دیتے ہوئے بڑی دیدہ دلیری سے عام مسلمانوں پر ان آیات کا انطباق کرنا شروع کر دیتے ہیں اور نتیجتاً مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت کو منافق' کافر' مشرک اور جہنمی بنا دیتے ہیں۔ مثلاً ایک مدرس اپنے درس کے لیے نفاق سے متعلقہ آیات کا انتخاب کرتا ہے' پھر اُن آیات کا عام مسلمانوں پر انطباق کرتا ہے' اور آخر میں آیت مبارکہ ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ سنا کر اپنے تئیں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو جہنمی اور اس آیت مبارکہ کا مصداق بنا دیتا ہے۔ یہ طرزِ عمل قرآن کے اس مقصد کے بھی خلاف ہے جس کی خاطر اس کو نازل کیا گیا ہے۔ قرآن اس لیے نہیں آیا کہ ہم لوگوں پر فتوے لگا کر خوش ہوں کہ تم جہنمی ہو' منافق ہو' مشرک ہو' کافر ہو وغیرہ' بلکہ قرآن تو اس لیے آیا ہے کہ ہم لوگوں کو نفاق' شرک اور کفر سے نکال کر جنتی بنائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تبشیر (جنت کی بشارت) کے ساتھ ساتھ انذار (آخرت کا خوف دلانا) بھی مطلوب ہے' لیکن انذار اور فتویٰ میں بہت فرق ہے۔ انذار یہ ہے کہ آپ لوگوں کو خبردار کریں' انہیں بتائیں کہ یہ منافقین کی صفات ہیں' یہ اعمال مشرکانہ یا کافرانہ ہیں' قرآن نے ان چیزوں سے روکا ہے اور ان کے مرتکبین کو جہنم کی وعید سنائی ہے۔ یہ تو انذار کا انداز ہے۔ جب کہ فتویٰ کا اسلوب یہ ہے کہ آپ کہیں جو یہ کام کرے گا وہ کافر ہے' مشرک ہے' جہنمی ہے' ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے

گا۔قرآنی آیات کا مخصوص مسلمانوں اور مسلمان معاشروں پر انطباق کرنا شرعی اصطلاحات کے مطابق اجتہاد ہی کی ایک قسم ہے اور یہ کام فقہاء اور مفتیانِ کرام کا ہے' مدرسین کا نہیں۔عربی زبان کے چند بنیادی قواعد کو سیکھ لینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آدمی درجۂ اجتہاد اور مسند افتاء پر فائز ہو گیا ہے اور اس کے پاس یہ سند آ گئی ہے کہ لوگوں پر قرآنی نصوص کا انطباق کرتا پھرے' بلکہ مدرسین کو چاہیے کہ اپنے دروس میں عوام الناس کو منافق اور جہنمی قرار دینے کی بجائے انہیں ایک باعمل مؤمن اور جنتی بنانے کی طرف توجہ دیں۔

ایک خاتون نے راقم الحروف کو بتایا کہ وہ لاہور کے ایک معروف دینی ادارے میں سمر کورس کرنے کے لیے تشریف لے گئیں تو پہلے ہی دن معلّمہ نے ایمان و اسلام کے تقاضوں پر درس دینے کے بعد تمام خواتین سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اس بات کا اقرار کریں کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔تو وہاں پر موجود سب خواتین نے معلّمہ کے درسِ قرآن سے متأثر ہو کر اس بات کا اقرار کیا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔مذکورہ خاتون نے مزید بتایا کہ اگلے دن جب وہ کلاس میں شرکت کے لیے تشریف لے گئیں تو انہوں نے کلاس میں موجود خواتین کو سلام نہ کیا۔اس پر کلاس میں موجود تمام خواتین نے ان سے اس بات پر احتجاج کیا کہ آپ نے کلاس میں داخل ہوتے وقت سلام کیوں نہیں کیا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ صرف مسلمانوں کو سلام کرنا چاہیے جبکہ کل پوری کلاس نے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ ہم مسلمان نہیں ہیں۔کچھ ہی دیر بعد معلّمہ صاحبہ کلاس میں تشریف لے آئیں اور انہوں نے آتے ہی پوری کلاس سے سوال کیا کہ کیا آپ کے اندر ایمان ہے؟ تو ساری کلاس کا سر شرم کے مارے جھک گیا۔پھر معلّمہ صاحبہ نے کہا تمہیں کیا معلوم کہ ایمان کیا ہوتا ہے! آج میں تمہیں بتاؤں گی کہ ایمان کیا ہے اور اس کے کیا تقاضے ہیں!

یہ تو صرف ایک واقعہ ہے' اس قسم کے بیسیوں دروس میں باقاعدہ سامعین سے اس بات کا اقرار یا کم از کم یہ باور کرایا جاتا ہے کہ وہ منافق ہیں اور ایمان سے خالی ہیں۔ہمارے خیال میں یہ طرزِ عمل اس حکمت کے بھی منافی ہے جس کے بارے میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ دعوت و تبلیغ میں اس کو ملحوظ رکھیں۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ (النحل:۱۲۵)

''(اے نبیؐ!) اللہ کے راستے کی طرف بلائیے حکمت کے ساتھ اور اچھی نصیحت کے

ساتھ اور اُن سے مجادلہ کیجیے اس طریقے پر جو کہ بہتر ہو۔''

۳) تفسیر بالمأثور کا التزام

تفسیر کی دو قسمیں ہیں: تفسیر بالمأثور اور تفسیر بالرائے۔ تفسیر کی پہلی قسم ''تفسیر بالمأثور'' کے جواز کے بارے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے' جبکہ دوسری قسم ''تفسیر بالرائے'' کے جائز ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال اور تفاصیل ہیں۔

تفسیر بالمأثور کو ''تفسیر بالروایہ'' یا ''تفسیر بالمنقول'' بھی کہتے ہیں۔ اس کی مزید چار قسمیں ہیں:

۱) قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کرنا
۲) قرآن کی تفسیر حدیث سے کرنا
۳) قرآن کی تفسیر اقوالِ صحابہؓ سے کرنا
۴) قرآن کی تفسیر اقوالِ تابعینؒ سے کرنا

اللہ کے رسول ﷺ جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن کے الفاظ سکھاتے تھے اسی طرح قرآن کے معانی بھی بتاتے تھے' کیونکہ یہ آپؐ کی ذمہ داری تھی کہ صحابہؓ کو قرآن کے الفاظ کے ساتھ ساتھ معانی بھی بتائیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل: ٤٤)

''اور ہم نے (اے نبیؐ!) آپ کی طرف الذکر (قرآن) کو نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے لیے ان کی طرف نازل کردہ چیز (قرآن مجید) کے معانی واضح کر دیں''۔

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی نبھایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآنی الفاظ کے معانی کی بھی تعلیم دی۔ مشہور تابعی ابوعبدالرحمٰن السلمی کا قول ہے:

حدثنا الذين يقرء ون القرآن كعثمان بن عفان و عبد الله بن مسعود وغيرهم أنهم كانوا اذا تعلموا من النبي ﷺ عشر آيات لم يتجاوزها حتى يعلموا ما فيها من العلم و العمل(۲)

''جن صحابہؓ نے ہمیں قرآن پڑھایا' مثلاً حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبداللہ ابن مسعود وغیرہ' وہ ہم سے کہتے تھے کہ جب وہ اللہ کے نبی ﷺ سے دس آیات کی تعلیم حاصل کر لیتے تو اُس وقت تک آگے نہ بڑھتے تھے جب تک ان دس آیات کا مکمل علم وعمل حاصل نہ کر لیتے تھے''۔

اس قسم کے اور بھی بہت سارے آثار مروی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن کی تفسیر خود بیان کی ہے۔ ہمارے ہاں مدرسین میں حدیث کا فہم اور مطالعہ نہ ہونے کی وجہ سے عموماً یہ کوتاہی پائی جاتی ہے کہ وہ بعض اوقات آیاتِ قرآنیہ کی ایسی تفسیر کر جاتے ہیں جو احادیثِ رسول ﷺ کے صریحاً خلاف ہوتی ہے۔

ایک مدرسِ قرآن جو ماشاء اللہ بہت نیک طبع اور باعمل تحریکی کارکن ہیں' انہوں نے جب ایک آیت مبارکہ کی تفسیر اپنی ذاتی رائے سے بیان کی تو راقم الحروف نے ان کو متنبہ کیا کہ ان کی یہ تفسیر صحیح حدیث کے خلاف ہے۔ مزید برآں جب اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں بخاری شریف کی ایک حدیث اُن صاحب کو پیش کی گئی اور ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی کہ جلیل القدر ائمہ مفسرین مثلاً ابن کثیر وغیرہ نے بھی اس آیت مبارکہ کی تفسیر اسی حدیث سے کی ہے اور جو تفسیر بالرائے آپ بیان کر رہے ہیں وہ آج تک کسی مفسر نے نہیں بیان کی تو اُن کا مجھے یہ جواب موصول ہوا کہ ائمۂ سلف کی تفسیر بیان کرنے کی بجائے خود بھی اس آیت مبارکہ پر غور کر لیجیے۔ قابل تعجب بات یہ ہے کہ عربی زبان کی واجبی سی شد بد حاصل کرنے کے بعد مدرسین یہ سمجھتے ہیں کہ وہ امام ابن کثیر' علامہ قرطبی اور ابن جریر طبری جیسے جلیل القدر مفسرین کی صف میں' بلکہ شاید اُن سے بھی کچھ آگے کھڑے ہیں۔ یہ ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ علم حدیث سے ناواقفیت کی وجہ سے اللہ کے رسول ﷺ کی تفسیر سے ہٹ کر تفسیر بالرائے کرتے ہیں اور اس پر مصر بھی ہوتے ہیں۔ جان لیجیے کہ یہ اہل سنت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ جو تفسیر بھی حدیث کے خلاف ہوگی وہ مردود اور قابل مذمت ہے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی فرماتے ہیں:

> ''تفسیر میں اصل گمراہی کا سبب اس بنیادی حقیقت کو بھول جانا ہے کہ قرآن کے مطالب وہی ہیں جو اس کے مخاطبِ اوّل (یعنی محمد ﷺ) نے سمجھے اور سمجھائے ہیں۔ قرآن محمد ﷺ پر نازل ہوا اور قرآن بس وہی ہے جو محمد ﷺ نے سمجھا اور سمجھایا ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے' یا تو علمی' روحانی نکتے ہیں' جو قلبِ مؤمن پر القاء ہوں اور یا پھر اقوال و آراء ہیں' انکل پچو باتیں ہیں' جن کے محتمل قرآنی لفظ کبھی ہوتے ہیں اور کبھی نہیں ہوتے' لیکن یہ یقینی بات ہے کہ وہ باتیں قرآن سے مقصود نہیں ہیں۔ قرآنی مقصود صرف وہی ہے جو رسول ﷺ نے سمجھا اور سمجھایا ہے۔ دوسری کسی بات کو مقصودِ قرآنی کہنا ظلم و زیادتی ہے اور افتراء علی اللہ''۔ (۳)

لہٰذا مدرسین کو چاہیے کہ درسِ قرآن دیتے ہوئے حدیث اور اقوالِ صحابہؓ کا خصوصی اہتمام

کریں۔ اصل تفسیر ''تفسیر بالماثور'' ہی ہے۔ تفسیر کی اس قسم میں احتیاط ملحوظ رکھنا اس قدر ضروری ہے کہ تفسیر سے متعلقہ احادیث' اقوالِ صحابہ اور اقوال تابعین کو بیان کرتے وقت صحیح سند سے ثابت شدہ احادیث اور اقوال کا التزام کیا جائے۔ تفسیر بالماثور پر مشتمل معروف تفاسیر میں تفسیر طبری' تفسیر ابن کثیر اور مولانا عبدالرحمٰن کیلانی صاحب کی تیسیر القرآن کا مطالعہ مدرسین کو لازماً کرنا چاہیے' کیونکہ یہ تفاسیر ایک مدرس بلکہ مفسر کے لیے بھی ایک حد قائم کر دیتی ہیں کہ یہ وہ حدود ہیں جن سے قرآن کے درس اور تفسیر میں تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔

۴) تفسیر بالرائے سے اجتناب

اس کو ''تفسیر الدرایہ'' اور ''تفسیر بالمعقول'' بھی کہتے ہیں۔ اس سے مراد قرآن کی تفسیر خود قرآن' یا حدیث' یا اقوال صحابہ یا اقوالِ تابعین سے کرنے کی بجائے اپنے اجتہاد اور رائے کی بنیاد پر کرنا ہے۔ تفسیر بالرائے کی دو قسمیں ہیں: تفسیر بالرائے محمود اور تفسیر بالرائے مذموم۔

تفسیر بالرائے محمود: درج ذیل اوصافِ ثلاثہ پر مشتمل تفسیر' تفسیر بالرائے محمود کہلاتی ہے:

۱) جو تفسیر سلف صالحین کے عقیدے' منہج تفسیر اور اصولِ تفسیر کے مطابق ہو۔

۲) تفسیر بالماثور کے مخالف نہ ہو اور قواعد لغویہ عربیہ کے موافق ہو۔

۳) جس کے مفسر میں تفسیر کی تمام علمی' اخلاقی' دینی' عقلی اور عملی شرائط پائی جاتی ہوں۔

تفسیر بالرائے مذموم: اگر کسی تفسیر میں درج ذیل اوصاف میں سے کوئی ایک وصف بھی پایا جائے تو وہ تفسیر بالرائے مذموم ہے:

۱) جو سلف صالحین کے عقیدے' منہج تفسیر یا اصولِ تفسیر کے خلاف ہو۔

۲) تفسیر بالماثور یا قواعد لغویہ عربیہ کے خلاف ہو۔

۳) جس کا مفسر جاہل ہو یا ان تفسیری علوم سے ناواقف ہو کہ جن کا علم ایک مفسر کے لیے از بس ضروری ہے' مثلاً علمِ حدیث' علمِ لغت' علمِ نحو' علمِ صرف' علمِ اشتقاق' علمِ بلاغت' علمِ اصولِ فقہ' علمِ قراءت' علمِ ناسخ و منسوخ' علمِ اسبابِ نزول' علمِ اصول الدین (یعنی عقائد)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ تفسیر بالرائے جائز ہے' لیکن اس کے باوجود صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ اپنے تقویٰ و ورع کی بنیاد پر تفسیر بالرائے سے

حتی الامکان گریز کرتے تھے اور ممکن حد تک تفسیر بالماثور پر ہی اکتفا کرتے تھے' جیسا کہ درج ذیل آثار سے واضح ہوتا ہے۔

امام ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

۱) حضرت ابو معمر الأزدیؒ سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے قرآن کی آیت ﴿وَفَاكِهَةً وَّأَبًّا﴾ کے بارے میں سوال ہوا تو جواب میں آپؓ کہنے لگے:

أیّ أرض تقلنی و أیّ سماء تظلنی اذا قلتُ فی القرآن برأیی(۴)

''کون سی زمین مجھے اٹھائے گی اور کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اگر میں قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کروں؟''

۲) حضرت ابن ابی ملیکہؒ سے روایت ہے کہ:

أنّ ابن عباس سئل عن آیة لوسئل عنها بعضکم لقال فیها' فابی أن یقول فیها(۵)

''حضرت ابن عباسؓ سے قرآن کی ایک آیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے اس آیت کی تفسیر سے اجتناب کیا۔ اگر تم میں سے کسی سے اس آیت کے مفہوم کے بارے میں سوال کیا جاتا تو وہ ضرور اس کا مفہوم بتا دیتا''۔

۳) حضرت طلق بن حبیبؒ سے روایت ہے کہ وہ حضرت جندبؓ کے پاس آئے اور ان سے قرآن کی ایک آیت کی تفسیر پوچھی' حضرت جندبؓ نے جواب دیا:

''میں تمہیں قسم دیتا ہوں کہ اگر تم مسلمان ہو تو میرے پاس سے اٹھ جاؤ۔ یا یہ کہا کہ میرے پاس مت بیٹھو''۔

۴) حضرت یزید بن ابی یزیدؒ سے روایت ہے کہ:

کنا نسأل سعید بن المسیب عن الحلال و الحرام' و کان اعلم الناس' فاذا سالناه عن تفسیر آیة من القرآن سکت کان لم یسمع(۷)

''ہم حضرت سعید بن مسیبؒ سے حلال و حرام کے بارے میں سوال کرتے تھے' کیونکہ انہیں اس چیز کا سب سے زیادہ علم تھا' لیکن جب ہم ان سے قرآن کی کسی آیت کی تفسیر پوچھتے تو وہ ایسے خاموش ہو جاتے تھے جیسے انہوں نے کچھ سنا ہی نہ ہو''۔

۵) علامہ ابن سیرینؒ سے روایت ہے کہ میں نے عبیدہ السلمانیؒ سے قرآن کی ایک آیت کی تفسیر پوچھی تو انہوں نے کہا:

ذهب الذين كانوا يعلمون القرآن فيم أنزل القرآن ' اتق الله و عليك بالسداد (۸)

''وہ لوگ چلے گئے جو یہ جانتے تھے کہ قرآن کس بارے میں نازل ہوا۔تمہارے لیے یہ کافی ہے کہ اللہ سے ڈرو اور سیدھی راہ پر چلتے رہو''۔

۶) علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ ابراہیم نخعیؒ کہتے تھے:

''ہمارے اساتذہ تفسیر کرنے سے بچتے اور ڈرتے تھے''۔(۹)

۷) مسروقؒ کہا کرتے تھے:

''تفسیر کرنے سے بچو اور ڈرو' کیونکہ تفسیر اللہ کی طرف سے روایت ہے''۔(۱۰)

مذکورہ بالا آثار سے واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ اور تابعین پر قرآن کی کسی آیت کی تفسیر کرتے وقت کس قدر اللہ کا خوف اور ڈر غالب ہوتا تھا باوجود یکہ وہ اس کے سب سے زیادہ اہل بھی تھے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ:

۱) تفسیر بالرائے سے حتی الامکان گریز کرنا چاہیے۔

۲) اگر تفسیر بالرائے کرنی ہی ہو تو ایسا شخص کرے جو صحیح معنوں میں اس کا اہل ہو اور ان شرائط کے مطابق کرے جو کہ تفسیر بالرائے محمود کے ضمن میں اوپر بیان ہو چکی ہیں۔

۳) علاوہ ازیں یہ کہ تفسیر بالرائے کرنے کے بعد بھی اس کو اپنی رائے ہی کے طور پر بیان کرے اور اللہ کی طرف اس کی نسبت کرنے سے ڈرتا رہے۔

۴) ہمارے ہاں مدرسین چونکہ تفسیر بالرائے کی مذکورہ بالا شرائط پر پورے نہیں اُترتے لہٰذا ان کے لیے درسِ قرآن دیتے وقت قرآنی آیات کا مسلم معاشروں پر انطباق کرنا یا ان سے نئی نئی تفاسیر اختراع کرنا بالکل بھی جائز نہیں ہے۔ مدرسین کو چاہیے کہ اپنے دروس میں اوّل تو تفسیر بالماثور پر ہی اکتفا کریں' لیکن اگر تفسیر بالرائے کے ضمن میں کچھ بیان کرنا بھی ہے تو صرف معروف معاصر مفسرین کے حوالے سے ہی کچھ بیان کر دیں اور اپنی الگ رائے ہرگز پیش نہ کریں!

۵) قرآن کتاب ہدایت ہے

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن میں ہمیں مختلف علوم کا تذکرہ ملتا ہے' لیکن یہ بات یقینی ہے کہ قرآن نہ تو سائنس کی کتاب ہے اور نہ ہی فلسفے کی' بلکہ یہ کتاب ہدایت ہے۔ یہی

وجہ ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو اور ان کی آئندہ آنے والی ذرّیت کو جنت سے اتار کر اس دنیا میں بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا تو اللہ کی طرف سے یہ فرمان جاری ہوا:

﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (البقرۃ)

''ہم نے کہا تم سب یہاں سے اتر جاؤ' پس جب تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو بھی میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا تو انہیں نہ تو کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ (البقرۃ)

''یہ کتاب' اس میں کوئی شک نہیں ہے' یہ ہدایت ہے متقین کے لیے''۔

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

''یہ رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا' یہ پوری نوع انسانی کے لیے ہدایت ہے اور ہدایت کے واضح دلائل پر مشتمل ہے''۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی لکھتے ہیں:

''پرانے وقتوں میں یونانی فلسفے' ایرانی اوہام اور ہندی تصوف کے جال پھیلے ہوئے تھے۔ موجودہ زمانے میں یورپ کی ذہنی غلامی نے عقلوں پر قبضہ کر رکھا ہے اور یورپ کی خرافات کو بھی حقائق سمجھ لیا گیا ہے۔ کتاب اللہ کو توڑ مروڑ کر یورپین نظریوں پر منطبق کرنے کا ایک جنون پھیلا ہوا ہے۔ کوئی ڈارون کی تھیوری قرآن سے ثابت کرتا ہے اور کوئی آئن سٹائن کے نظریے کو قرآن پر چسپاں کرتا ہے۔ حالانکہ کتاب اللہ کا مقام اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے کہ اسے انسانی تخیلات کا تابع بنایا جائے۔ کتاب اللہ نہ عقلیات کی کتاب ہے اور نہ سائنس میں دخل دیتی ہے' وہ تو انسانی ہدایت کے لیے آئی ہے' اور اس سے کھیلنا نہیں بلکہ ہدایت حاصل کرنا چاہیے تھا۔ قرآن عقل سلیم کے عین مطابق ہے' لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ علمائے یورپ کے جملہ نظریات و اوہام کی کسوٹی پر بھی پورا اترے!''(۱۱)

۶) قرآن کی عملی تفسیر

ایک اور چیز جس کو عام طور پر مدرسینِ قرآن نظر انداز کر دیتے ہیں' وہ قرآن کی علمی اور عملی تفسیر کا فرق ہے۔ نظم و مفردات کی دقیق اور فصاحت و بلاغت کی لطیف بحثیں تفسیر قرآن کا تو موضوع ہو سکتی ہیں لیکن انہیں درس قرآن کا موضوع بنانا دعوت و تبلیغ کی حکمت کے منافی ہے۔ اس لیے کہ یہ ساری بحثیں سامعین کو محض وقتی لطف و تسکین ہی فراہم کر سکتی ہیں۔ جہاں تک انذار' تبشیر اور تذکیر کا معاملہ ہے' تو ایسی بحثوں سے بالعموم ان مقاصد کے حصول کی بجائے ان کے برعکس نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ درس قرآن کا اصل مقصد لوگوں کو قرآن پر عمل کرنے کے لیے ترغیب و تشویق دلانا ہو نہ کہ قرآن کے علمی' اعجازی اور بلاغی پہلوؤں کی وضاحت کرنا۔

راقم الحروف نے پہلی مرتبہ جب رمضان کے مہینے میں نماز تراویح کے ساتھ ترجمۂ قرآن کی کلاس کا آغاز کیا تو شروع شروع میں اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر ترجمۂ قرآن کے درمیان اکثر و بیشتر وقت نظم قرآن کی پیچیدہ بحثوں کو سلجھانے میں لگ جاتا تھا' جو ایک طرف تو عوام الناس کی سمجھ سے بالاتر تھیں اور دوسری طرف حقیقت یہ تھی کہ ان ابحاث کا کوئی تعلق سامعین کے عمل سے نہ تھا۔ دوسری بار جب راقم الحروف نے رمضان کے دوران ترجمہ قرآن کی کلاس میں نظم قرآن اور اشتقاقاتِ قرآن کی بحثوں کی بجائے سامعین کو ایسی احادیث' اقوال صحابہ اور تاریخی واقعات سنائے جن کا تعلق عملی پہلو سے تھا تو لوگوں نے بھی پہلے کی نسبت زیادہ اثر لیا۔ جب تیسری بار رمضان میں ترجمۂ قرآن کرایا تو آیت ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ۝ وَاِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝﴾ (الزُّخرف) کے ذیل میں سواری پر سوار ہونے کی دعا اور طریقہ بتلایا تو درس کے بعد ایک بزرگ نے اس بات کی طرف میری توجہ دلائی کہ '' پچھلی دفعہ آپ نے اس آیت کی تشریح میں فلاں حدیث بیان کرتے ہوئے سواری پر سوار ہونے کا جو طریقہ بتایا تھا وہ اس سے قدرے مختلف ہے جو آپ نے آج بتایا ہے''۔ دیکھئے ان صاحب نے اس حدیث کو یاد رکھا حالانکہ خود مجھے وہ حدیث بھول چکی تھی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ حدیث عمل سے متعلق تھی لہٰذا اس کو سننے کے بعد وہ اپنے عمل میں بھی لے آئے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ نظمِ قرآن اور فصاحت و بلاغت کی علمی ابحاث طالبانِ قرآن کے لیے تعلیم و تعلم کے مراحل میں تو مفید ثابت ہو سکتی ہیں' جبکہ وعظ و نصیحت کے حلقوں میں اس قسم کے علمی نکات سے سامعین کی اصلاح تو نہیں ہوتی البتہ مدرسین کا علمی رعب ضرور قائم ہو جاتا

ہے۔ ویسے بھی ترجمہ قرآن اور درسِ قرآن کی مختصر دورانیہ کی مجالس میں اس قسم کی پیچیدہ بحثوں میں الجھنا اس لیے بھی کوئی مستحسن امر نہیں ہے کہ کم ہی مدرسین ایسے ہوتے ہیں جو ایسی بحثوں کو چھیڑ کر ان کا حق ادا کر سکیں۔

۷) ابلاغ کے ساتھ اصلاح بھی

ہمارے ہاں دروسِ قرآن میں اصلاح سے زیادہ ابلاغ پر زور ہوتا ہے اور ہر درس کے آخر میں بغیر سوچے سمجھے ہم یہ آیت بھی تلاوت کر دیتے ہیں:

﴿وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ﴾ (یٰسٓ)

''اور نہیں ہے ہماری ذمہ داری مگر واضح طور پر پہنچا دینا''۔

لیکن ہم حضرت شعیب علیہ السلام کے اس قول کو بھول جاتے ہیں جو انہوں نے اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

﴿اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ﴾ (ھود:۸۸)

''میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں جس قدر میں کر سکتا ہوں''۔

داعی اور مدعو کا اصل رشتہ صرف ابلاغ کا نہیں ہے' بلکہ ''ابلاغ مع الاصلاح'' کا ہے۔ مدرسین کو چاہیے کہ اپنے دروس کو ابلاغ کے ساتھ ساتھ مخاطبین کی اصلاح کا بھی ذریعہ بنائیں۔ درس قرآن کے ذریعے ہم لوگوں کی اصلاح کیسے کر سکتے ہیں' اس کو ایک زندہ مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ سمیہ رمضان ایک مُدرِّسہ ہیں جو کہ اپنے ہفتہ وار درسِ قرآن میں ہر ہفتے ایک آیت کا انتخاب کرتی ہیں اور درسِ قرآن کے شرکاء کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اس ہفتے دن رات اس آیت کے معانی پر غور کرتے ہوئے اس کا وِرد کریں۔ ایسے ہی ایک درس میں محترمہ سمیہ رمضان نے قرآن کی درج ذیل آیت ﴿وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ﴾ (التغابن) کا انتخاب کیا اور درس کے تمام شرکاء کو یہ ہدایت کی کہ وہ اس آیت کا اس ہفتے توجہ کے ساتھ مسلسل وِرد جاری رکھیں۔ ایک خاتون جو کہ درس میں شریک ہوتی تھیں' گھر میں بہت زیادہ چیختی چلاتی تھیں۔ اس آیت کا وِرد ان کی اصلاح کا کس طرح ذریعہ بنا' یہ انہی کی زبانی ہم سنتے ہیں:

''جیسا کہ درس میں محترمہ سمیہ نے راہنمائی کی تھی' میں یہ آیت بار بار دہراتی رہی حتیٰ کہ مجھے حفظ ہو گئی۔ یوں ایک دن گزر گیا۔ اگلے دن کی صبح حسب معمول بچے اسکول جانے کے لیے تیاری کر رہے تھے۔ اس مرحلے پر جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میری حالت

انتہائی قابل رحم ہوتی ہے۔ایک ہی وقت میں ہر کوئی اپنی اپنی چیز مانگ رہا ہوتا ہے۔ مجھے اس موقع پر چلانے کی عادت تھی' میں بچوں کے ساتھ چیخ چیخ کر باتیں کرتی تھی' مگر اس صبح میں نے آیت کریمہ ﴿وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۚ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ﴿۱۹﴾﴾ پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔اس آیت کے نفاذ کے حقیقی ٹسٹ کے وقت' بچوں کے رویے کی وجہ سے میرے رویے میں بھی شدت آنے لگی۔ میرے مزاج میں آج پھر تیزی آنے لگی' کیوں کہ ایک بچے کو جوتا نہیں مل رہا تھا' دوسرے کو بیلٹ' تیسرے کو پین اور چوتھے کو بستہ۔ یہ سن کر میری کیفیت وہی ہوگئی جو پہلے ہوتی تھی۔ میں نے بچوں کو زور زور سے ڈانٹنا شروع کر دیا۔مگر اسی لمحے میں نے محسوس کیا کہ میرا چہرہ سرخ ہوگیا ہے اور میری شکل گدھے کی سی ہو رہی ہے' کان گدھے کی طرح لمبے ہو رہے ہیں۔ میں نے فوراً سوچا کہ گدھے کی طرح آواز نکالنے سے تو ہمیں روکا گیا ہے۔ہمیں اپنی آواز گدھے سے مشابہ نہیں کرنی چاہیے۔اللہ تعالیٰ نے جب روک دیا ہے' اپنا حکم دے دیا ہے تو پھر ہمیں اس حکم کی تعمیل کرنی چاہیے۔کہیں ہماری شکل بگڑ نہ جائے' ہم یہودیوں کی طرح خنزیروں اور بندروں کی صورت میں مسخ نہ کر دیے جائیں! میں چیخنے چلانے کی اس تشبیہ کا تصور کر کے شرمندہ ہوئی' کیوں کہ اس طرح میں انسانوں سے نکل کر حیوانوں کے زمرے میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ تصور آتے ہی میں بچوں کے لیے نرم پڑ گئی اور آہستہ آہستہ بولنے لگی۔ ''ہاں یہ لے لو' یہ تمہارا جوتا ہے' قلم بھی یہیں کہیں ہوگا' تم نے اپنی ضروری چیزیں کل ہی اپنے بستے میں کیوں نہ رکھ لیں''۔ یوں یہ مشکل ترین مرحلہ آسانی سے گزر گیا۔ان چند منٹوں میں میرا غصہ اپنی انتہا کو پہنچ جایا کرتا تھا اور مجھے اپنی جان نکلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی' لیکن اس دن یہ لمحے سکون و قرار سے گزر گئے''۔(۱۲)

اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے ہم ہر ہفتے ایک آیت کا انتخاب کر کے اپنی اور سامعین کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہم سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ﴿۳۴﴾﴾ کے ورد سے عہد کی پابندی' سورۂ مریم کی آیت ﴿فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾﴾ کے ورد سے نماز کی پابندی اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۭ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾﴾ کے ورد سے اپنے آپ کو اور اپنے درس کے شرکاء کو نماز فجر کی جماعت کے ساتھ ادائیگی پر آمادہ کر سکتے ہیں۔اسی طرح غیبت'

بہتان، تمسخر اور سوئے ظن جیسی معاشرتی برائیوں سے بھی سورۃ الحجرات کی آیات کو موضوع درس بنانے سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس سورۃ المؤمنون کی شروع کی آیات اور سورۃ الفرقان کی آخری آیات کو بھی اپنی اصلاح کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے اور سورۃ التوبہ اور سورۃ الصف کی منتخب آیات کے مذاکرے اور ورد سے باطل نظام کے خلاف جذبات کو مہمیز دینے اور اللہ کی رضا کی خاطر تن من دھن لگانے کے دواعی پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کا بہتر اور مفید طریقہ یہی ہے کہ ایک ہفتے کے لیے صرف ایک ہی آیت یا حکم کا انتخاب کر کے اس کے کثرتِ ذکر سے اس آیت کو اس کے مفہوم سمیت حرزِ جان بنایا جائے۔

۸) درس قرآن کا معیار

درس قرآن کے حوالے سے جو کوتاہیاں پائی جاتی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں درس قرآن کے لیے مدرس کا کوئی معیار مقرر نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں ایک مدرس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کم از کم عربی زبان کے بنیادی قواعد اور اسالیب سے واقف ہو اور اس کی تجوید اس قدر درست ہو کہ قرآن پڑھتے وقت لحن جلی کا مرتکب نہ ہو۔ ایک مدرس اگر قرآن کی تلاوت بھی صحیح طرح نہ کر سکتا ہو تو اس کو درس قرآن کی اجازت دینا قرآن کے ساتھ ظلم ہے۔ ایسے مدرسین جو کہ درس قرآن کے کم از کم معیار پر بھی پورے نہ اترتے ہوں، انہیں چاہیے کہ یا تو وہ درسِ قرآن کی بجائے انفرادی دعوت و تبلیغ کے میدان کا انتخاب کریں یا پھر کسی مستند عالم دین کے ترجمہ و تفسیر قرآن کی مجالس قائم کریں۔ فہم قرآن کی مختلف تحریکوں اور جماعتوں کے منتظمین کو بھی چاہیے کہ وہ علماء کی زیر نگرانی مدرسین کے لیے مختلف قسم کی تربیتی ورکشاپوں کا بھی وقتاً فوقتاً انعقاد کرتے رہیں۔

حواشی

۱) صحیح البخاری، کتاب بدء الوحی، باب بدء الوحی۔

۲) الاتقان فی علوم القرآن، امام سیوطی، جلد ۲، ص ۱۷۶۔

۳) مقدمة اصول تفسیر از علامہ ابن تیمیہ، ترجمة مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی، ص ۸۔

٤) تفسیر طبری، امام ابن جریر طبری، جلد ۱، ص ۷۸، دار المعارف مصر۔

۵، ٦، ۷، ۸) تفسیر طبری، امام ابن جریر طبری، جلد ۱، ص ۸٦، دار المعارف مصر۔

۹، ۱۰، ۱۱) مقدمہ اصول تفسیر از علامہ ابن تیمیہ، ترجمہ مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی، ص ٦۹۔

۱۲) قرآن پر عمل، سمیہ رمضان، ص ۴۰، ۴۱۔ منشورات، منصورہ لاہور۔

فناءِ نار کا عقیدہ
اور
امام ابن تیمیہؒ اور امام ابن قیمؒ کا موقف
ایک غلط فہمی کا ازالہ

حافظ محمد ارشد بن بشیر احمد عمری ☆

مسئلہ کی وضاحت

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ جنت وجہنم ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے انہیں فنا لاحق نہ ہو گی۔ قرآن وحدیث میں اس کے لیے بے شمار دلائل ہیں اور سلف صالحین کا اجماع اسی پر ہے اور کسی سے اس باب میں اختلاف ثابت نہیں۔ اور جو روایتیں یا صحابہؓ کے اقوال اس کے خلاف مروی ہیں وہ پرلے درجے کی ضعیف روایات و اقوال ہیں جن پر اعتبار کرنا صحیح نہیں۔ چند آیاتِ قرآنیہ ملاحظہ ہوں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) ﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝﴾ (المائدۃ)

''وہ چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں لیکن ہرگز اس سے نہ نکل سکیں گے اور ان کے لیے دوامی عذاب ہے۔'' (یہ آیت کافروں کے حق میں ہے)۔

(۲) ﴿لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ۝﴾ (الزخرف)

''یہ عذاب کبھی بھی ان سے ہلکا نہ کیا جائے گا اور وہ اسی میں مایوس پڑے رہیں گے۔''

(۳) ﴿فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ۝﴾ (النبا)

☆ متعلم، الجامعۃ الاسلامیۃ المدینۃ المنورۃ۔

''اب تم (اپنے کیے کا) مزہ چکھو' ہم تمہارا عذاب ہی بڑھاتے رہیں گے۔''

(٤) ﴿فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ (البيّنة:٦)

''سب دوزخ کی آگ میں (جائیں گے) جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

(٥) ﴿وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ﴾ (البقرة)

''اور یہ ہرگز جہنم سے نہ نکلیں گے۔''

(٦) ﴿وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ (الاعراف:٤٠)

''اور وہ لوگ کبھی جنت میں نہ جائیں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے کے اندر سے نہ چلا جائے۔''

(٧) ﴿لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا﴾ (فاطر:٣٦)

''نہ ان کی قضا ہی آئے گی کہ مر ہی جائیں اور نہ دوزخ کا عذاب ہی ان سے ہلکا کیا جائے گا۔''

(٨) ﴿اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا﴾ (الفرقان)

''یقیناً دوزخ کا عذاب چمٹ جانے والا ہے۔''

اس باب میں بے شمار احادیث ہیں۔ تفصیل کے لیے شرح عقیدہ طحاویہ [1] دیکھیں۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی رائے

ایک طالب حق جب امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی لکھی ہوئی موجودہ کتب میں غور کرے گا تو یقیناً وہ پائے گا کہ ابن تیمیہؒ فناءِ نار کے قائل نہیں' بلکہ وہ دوامِ نار کے قائل ہیں۔ آپ سلف صالحین سے اس عقیدہ پر اجماع نقل کرتے ہیں' جیسا کہ جنت اور عرش کے متعلق آپ نے ابدیت کا اجماع نقل کیا ہے' اور فناءِ نار کے قائلین کو بدعتی قرار دیتے ہیں۔ یہاں ہم اُن کے چند اقوال بیان کر دیتے ہیں تا کہ آپ کی جہتِ نظر واضح ہو۔

(١) ''فتاویٰ'' میں مذکور ہے کہ آپ سے حدیث انس بن مالکؓ کے متعلق پوچھا گیا۔ حدیث ہے:

عن انس بن مالك عن النبى ﷺ انه قال :((سبعة لا تموت ولا تفنى ولا تذوق الفناء :النار وسكانها واللوح والقلم والكرسى والعرش))

پوچھا گیا کہ کیا یہ حدیث صحیح ہے؟ تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

هذا الخبر بهذا اللفظ ليس من كلام النبى ﷺ وانما هو من كلام

بعض العلماء وقد اتفق سلف الامة وائمها وسائر اهل السنة والجماعة على ان من المخلوقات ما لا يعدم ولا يفنى بالكلية كالجنة والنار والعرش وغير ذلك، ولم يقل بفناء جميع المخلوقات الا طائفة من اهل الكلام المبتدعين، كالجهم بن صفوان ومن وافقه من المعتزلة ونحوهم وهذا قول باطل يخالف كتاب الله وسنة رسوله واجماع السلف وائمتها كما فى ذلك من الدلالة على بقاء الجنة واهلها، وبقاء غير ذلك مما لا تفسح هذه الورقة لذكره..... (۲)

''مختصر یہ کہ یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ پیارے نبی ﷺ سے صحیح سند سے ثابت نہیں، یہ بعض علماء کا قول ہے۔ سارے سلف صالحین، ائمہ کرام اور سارے اہل السنۃ والجماعۃ کا یہ اتفاق ہے کہ اللہ کی کچھ مخلوقات ایسی بھی ہیں جو کبھی فنا و ہلاک نہیں ہوں گی، جیسے جنت و جہنم اور عرش وغیرہ۔ کائنات میں کسی نے ان کے فنا ہونے کا ذکر نہیں کیا سوائے بعض بدعتی فرقوں کے، جیسے جہمیہ اور معتزلہ وغیرہ۔ یہ قول باطل ہے، کتاب وسنت اور اجماع سلف کے مخالف ہے، کیونکہ بقاءِ اہل جنت اور دوامِ جنت اور دیگر مذکورہ مخلوقات کے سلسلہ میں بے شمار دلائل موجود ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔''

(۲) ابن تیمیہؒ نے ''ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى'' کی تفسیر کے ضمن میں بیان کیا کہ کفار و مشرکین ہمیشہ ہمیشہ نارِ جہنم میں رہیں گے۔ (۳)

اس سے دکتور احمد عطیہ غامدی اور دکتور علی ناصر الفقیہی نے استدلال کیا اور کہا کہ:

فهذا كلام صريح فى ان النار لا تفنى كالجنة وان الكفار مخلدون فيها فهل يمكن ان يقال :ان شيخ الاسلام ابن تيمية نقل هذا الاجماع عن سلف الامة ثم بعد ذلك يناقضه؟ لا يظن لشيخ الاسلام ذلك قطعاً

یعنی ابن تیمیہؒ کی شخصیت اور ان کے منہج وعقائد پر عبور رکھنے والوں کا خیال یہ ہے کہ ''یہاں بات بالکل واضح ہے کہ جہنم جنت ہی کی طرح لافانی ہے اور کفار ہمیشہ کے لیے اسی میں رہیں گے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک طرف تو ابن تیمیہؒ سلف سے اجماع نقل کرتے ہوں اور پھر اس کی مخالفت کرتے ہوں؟ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی ذات سے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔'' (۴)

یہ ایک معمولی سی کوشش تھی کہ افرادِ اُمت کو اس حقیقت سے واقف کرایا جائے اور ان کی ذہنی الجھن کو دور کیا جائے' تاکہ وہ متنبہ ہوں اور اپنی واقفیت کا جائزہ لیں اور رجوع کریں۔ اگر واقعہ اس کے برعکس ہے تو پھر ہمیں مطلع کریں' اللہ ہمیں تحقیق سے محبت دے اور اندھی تقلید اور تعصب سے نفرت دے۔ آمین!

ابن قیم کا عقیدہ کیا تھا؟

اب آیئے ابن قیمؒ کے متعلق اڑائی گئی خبر کے حوالے سے تحقیق کرتے ہیں۔ عام طور پر ابن قیمؒ کی جن کتابوں کا حوالہ دیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ ابن قیمؒ فناءِ نار کے قائل تھے' ان میں سے ''حادی الأرواح الی بلاد الافراح'' نامی کتاب بھی ہے۔ اس کتاب کی چند مخصوص عبارتیں ہیں جن میں بڑے مبہم انداز میں انہوں نے فناءِ نار کے تعلق سے گفتگو فرمائی ہے جس سے دونوں معنی ظاہر ہوتے ہیں اور یہیں سے اشکالات اُبھرتے ہیں' لیکن اگر اسی کتاب کے کچھ مزید اوراق الٹ لیے جائیں تو معلوم ہوگا کہ وہ صراحت سے اس امر کے قائل ہیں کہ فناءِ نار کا عقیدہ بے بنیاد ہے اور اہل بدعت کا عقیدہ ہے۔ اِن شاء اللہ صفحاتِ ذیل میں یہی حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اس مسئلہ سے متعلق اپنی کتاب ''حادی الأرواح الی بلاد الافراح'' میں باب ۶۷ کے تحت انہوں نے چار فصلوں میں تفصیل سے جنت و نار کی ابدیت پر اقوال نقل کیے۔ دوسری فصل کا عنوان ہے ''الذین قطعوا بدوام النار لهم ست طرق'' یعنی جو لوگ نار کی ابدیت کے قائل ہیں ان کے حق میں چھ دلیلیں ہیں' اور اس فصل کے آخر میں کہا: ''شرعی دلائل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ گنہگار مؤمنین کے حق میں جہنم تو ہوگی لیکن ایک معینہ مدت تک۔ اب رہے کفار تو اُن کے حق میں جہنم ہمیشہ کے لیے ہے' اور یہی مسئلہ معرکۂ آراء بنا ہوا ہے' بہرحال جو شرعی دلائل پر اکتفا کرے وہ درستی پر ہے۔''

تیسری فصل کا عنوان ہے: ''الفرق بین دوام الجنة والنار عقلاً و شرعا'' یعنی جنت و جہنم کی ابدیت کے درمیان فرق واضح کیا کہ جنت ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گی۔ اب رہی جہنم تو یہ فنا بھی ہوسکتی ہے اور اس نظریہ کے لیے ۲۵ دلیلیں ہیں' اور باقاعدہ انہوں نے ۲۵ دلائل نقل کیے ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ جہنم بالآخر فنا ہو جائے گی۔ دوسری طرف انہوں نے ایک فریق جو کہ دوامِ نار (جہنم کی ہمیشگی) کا قائل ہے اس کے حق میں صرف چھ دلیلیں پیش کیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے' آخر کس فریق کے حق میں وہ صراحت کے ساتھ

اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں' لیکن نتیجہ میں وہ متردد نظر آتے ہیں اور صراحت کے ساتھ کسی کی ترجیح نہیں فرماتے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:

جب انہوں نے فصل کے آخر میں ۲۵ ویں دلیل پیش کی اور فوراً یوں گویا ہوئے کہ ''ہر دو فریق کے جتنے دلائل ممکن تھے میں نے جمع کر دیے ہیں' اتنی تفصیل تم کو دوسری کسی کتاب میں شاید ہی ملے۔''

پھر دونوں فریقوں کے پاس ابدیت جہنم و جنت کے درمیان فرق بتایا کہ ایک طرف سلف صالحین ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ''گنہگار مؤمنین کے حق میں جہنم ابدیت کا درجہ نہیں رکھتی''۔ جبکہ دوسرے فریق کا کہنا ہے کہ ''جنت کبھی فنا نہ ہونے والی ہے اور رہی جہنم تو وہ اللہ کے حوالے ﴿اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾'' یعنی اس کے ہاتھ میں فیصلہ ہے' وہ چاہے تو بغیر کسی تفریق کے سب کے حق میں جہنم فنا کر سکتا ہے۔ پھر اس کے بعد ایک سوال خود کرتے ہیں: ''اگر کوئی پوچھے کہ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے تو جواب دوں گا کہ ﴿اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾۔ جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''جنتی جنت میں داخل ہوں گے اور جہنمی جہنم میں داخل ہوں گے اور اپنا اپنا بدلہ پالیں گے' پھر اس کے بعد اللہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ بلکہ ساری مخلوق کا علم یہاں آ کر ختم ہو جاتا ہے۔''(۵)

قارئین دیکھ رہے ہیں کہ یہاں ابن قیم کا موقف واضح نہیں ہے' کیونکہ انہوں نے فناءِ نار کو اللہ کے ارادہ اور مرضی پر چھوڑا ہے۔ اس سے دو مطلب نکلتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر اللہ چاہے تو جہنم کو گنہگار مؤمنین کے حق میں فنا کر سکتا ہے' جیسے کہ قرآن' حدیث اور آثارِ سلف میں بے شمار دلائل موجود ہیں۔

دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے (جو یہاں زیادہ ظاہر ہے) کہ اللہ چاہے تو جہنم ہی کو سرے سے ختم کر سکتا ہے' کیونکہ وہ غفور و رحیم ہے۔

اب ظاہر ہے پہلا مطلب سلف صالحین کا موقف ہے اور دوسرا مبتدعہ کا۔

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ کیا ابن قیم نے دیگر کتب میں جہنم کی ابدیت کا صراحت سے اقرار کیا ہے یا نہیں؟ اگر بات ایسی ہے تو پھر ہم مبہم کو چھوڑ کر اس صراحت کو لیں گے۔ دُور نہیں بلکہ اسی کتاب میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ فناءِ نار کے قائلین کو مبتدع قرار دیتے ہیں(۶) بلکہ اگر میں کہوں تو اِن شاء اللہ بے جا نہ ہوگا کہ دراصل یہاں بظاہر جو تردد نظر آ رہا ہے وہ ابن قیم کا اپنا ایک خاص اسلوب ہے کہ وہ جہاں بھی اختلاف نقل کرتے ہیں تو پوری

آزادی سے پہلے دونوں فریقوں کے اقوال کا سروے کرتے ہیں۔ اس میں اتنی آزادی برتتے ہیں کہ قاری سمجھنے لگتا ہے کہ ہر دو فریق کے پاس دلائل موجود ہیں' لیکن یہ سروے اسی حد تک ہوتا ہے کہ مسئلہ کی وضاحت ہو جائے۔ پھر اس کے بعد اپنی ژرف نگاہی سے کسی ایک قول کے حق میں فیصلہ کرتے ہیں' تاکہ فریق مخالف اگر جمود رائے اور تعصب سے خالی ہو تو اس تحقیق سے مطمئن ہو اور تسلیم کرے' یا اگر تسلیم نہ بھی کرے تو کم از کم وہ بری الذمہ ہو جائیں اور مزید اس کو سوچنے کا موقع میسر ہو جائے۔

ایک جگہ وہ دوامِ نار (جہنم کی ہمیشگی) کا اقرار اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

وقد خلقت الجنة وما فيها وخلقت النار وما فيها خلقهما الله عزوجل وخلق الخلق لهما ولا يفنيان ولا يفنى ما فيها ابدا فان احتج مبتدع اوزنديق بقول الله عزوجل ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ﴾ وبنحو هذا من متشابه القرآن' قيل له : كل شيء مما كتب الله عليه الفناء بالهلاك هالك والجنة والنار خلقت للبقاء لا للفناء ولا للهلاك وهما من الآخرة لامن الدنيا۔

''جنت اور جو کچھ اس میں ہے پیدا کیا گیا ہے اور جہنم اور جو کچھ اس میں ہے اُسے بھی پیدا کیا گیا ہے' ان دونوں کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور ان کے لیے مخلوق کو بھی پیدا کیا' یہ دونوں (جنت اور جہنم) اور جو کچھ ان کے اندر ہے کبھی فنا نہیں ہوں گے (گویا جنت کی طرح جہنم بھی ہمیشہ ہمیشہ رہے گی) اگر کوئی بدعتی یا زندیق قرآن کی اس طرح کی آیات سے استدلال کرے: ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ﴾ تو ہم جواب دیں گے کہ یقیناً جس چیز کی ہلاکت اللہ نے مقدر کر رکھی ہے وہ ہلاک ہو جائے گی' اور رہی جنت و جہنم تو یہ بقا کے لیے اور ہمیشہ رہنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں نہ کہ فنا ہونے کے لیے' اور دوسری بات یہ کہ آیت کا مقصود دنیا سے متعلق ہے اور جنت و جہنم کا تعلق اُخروی زندگی سے ہے''۔ (۷)

ایک اور مقام پر وہ اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ اقرار کرتے ہیں:

''اللہ نے ساری اچھی اور بہترین چیزیں جنت میں بھر دی ہیں اور ساری برائی جہنم میں بھر دی ہے اور آنے والی زندگی (اُخروی زندگی) کو ہم تین مرحلوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(۱) ایک وہ ٹھکانہ جہاں صرف نیک لوگ ہی ہوں گے' برے لوگوں کے حق میں وہ نعمت حرام ہوگی' جہاں ساری پاک چیزیں جمع کر دی گئی ہیں۔
(۲) دوسرا ٹھکانہ وہ ہے جہاں صرف اور صرف برے اور خبیث لوگ ہوں گے۔
(۳) ایک تیسرا ٹھکانہ وہ ہے جہاں برے اور نیک لوگ مل کر رہیں گے۔ یہاں لوگ اپنے اپنے برے اعمال کے مطابق اپنے مقررہ وقت تک رہیں گے۔ جو جتنا جلد اپنے گناہوں سے دھل گیا اتنا ہی جلد وہ اس سے نجات پائے گا۔

اب رہا مشرک جس کے خمیر اور عقل میں محض خباثت ہی خباثت ہے' آگ اس کو پاک نہیں کر سکتی۔ اگر وہ آگ سے نکل بھی جائے تو اس کی خباثت باقی رہے گی۔ جیسے ایک کتا ہے' اگرچہ وہ سمندر میں داخل ہو لیکن جب وہ باہر نکلے گا کیا اس کی نجاست دھل جائے گی؟ (نہیں) اسی لیے اللہ نے مشرک کے حق میں جنت حرام قرار دی۔''(۸)

الوابل الصیب میں ہمیں ماقبل سے زیادہ صراحت ملے گی:

كانت دارهم ثلاثة دار الطيب المحض' ودار الخبيث المحض وهاتان الداران لا تفنيان ودار لمن معه خبث وطيب هي الدار التي تفنى وهي دار العصاة وانه لا يبقى في جهنم من عصاة الموحدين أحد' فانهم اذا عذبوا بقدر جزائهم اخرجوا من النار فادخلوا الجنة ولا يبقى الا الدار الطيب المحض والدار الخبيث المحض

''لوگوں کے تین ٹھکانے ہوں گے۔ ایک ٹھکانہ محض پاک لوگوں کے لیے ہے اور ایک ٹھکانہ وہ ہے جس میں صرف اور صرف برے لوگ ہوں گے اور ان دونوں کو فنا لاحق نہ ہوگا۔ جبکہ تیسرا ٹھکانہ گنہگار موحدین کا ہے۔ یہ تیسرے ٹھکانے والے جب اپنی سزا کاٹ چکے ہوں گے تو یہ ٹھکانہ برخواست کر دیا جائے گا اور اس کے بعد دو ہی ٹھکانے رہ جائیں گے' ایک خالص نیک لوگوں کا اور دوسرا خالص برے لوگوں کا۔''(۹)

یہاں تک مسئلہ خوب واضح ہے کہ ابن قیم جہنم کی ابدیت کے قائل ہیں۔ لیکن ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس مسئلہ میں ابن قیم کی یہی آخری رائے تھی؟

جواب میں علامہ ناصر الدین الالبانی ؒ فرماتے ہیں کہ جو یہ کہے کہ ابن قیمؒ کی آخری رائے یہی تھی کہ وہ ''فناء نار کے قائل تھے'' تو ہم کہیں گے بالجزم دلیل پیش کرو کہ یہی آخری

رائے تھی' ورنہ یہ بات بے پر کی سمجھی جائے گی۔ (۱۰)

اسی طرح دکتور علی ناصر الفقیہی کہتے ہیں کہ ہم بالجزم نہیں کہہ سکتے کہ آخری قول کون سا ہے' لیکن اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ جو عقیدہ اس باب میں معروف ومشہور ہے (نار ہمیشہ ہمیشہ رہے گی' کبھی فنا نہیں ہوگی اور مشرکین پر جنت حرام ہے اور جہنم ان کا ابدی ٹھکانہ ہے) بہرحال یہی عقیدہ ان کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے اور اس کے برعکس دوسرا عقیدہ ان کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی کئی وجوہات ہیں:

۱) حادی الارواح الی بلاد الافراح' ص ۳۵۲ میں سارے اقوال نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ (ان من کان السمع من جانبه فهو اسعد بالصواب) ''جس فریق کے پاس شرعی دلائل ہیں وہی جانب صواب ہے اور سچائی پر ہے۔''

۲) جو لوگ چند روایات کی بنیاد پر فناء نار کے قائل ہیں' یا کہیں ایک جگہ ان سے اس کے متعلق قول پایا گیا تو معلوم ہونا چاہیے کہ علماء نے ایسے اشخاص کے متعلق عذر پیش کیا ہے کہ انہوں نے جن آثار وروایات کو بنیاد بنا کر اپنی رائے قائم کی ہے وہ حقیقتاً روایۃً ودرایۃً قابل اعتبار نہیں' نتیجے میں ان کا شمار مجتہدین مخطئین کا شمار ہوگا (یعنی یہ ایک اجتہادی غلطی سمجھی جائے گی جس پر وہ معفو عنہ ہیں اور ایک نیکی کے حق دار ہیں۔)

۳) حادی الأرواح میں جب انہوں نے سارے اقوال نقل کیے وہیں صراحت کے ساتھ نقل کیا ہے:

''ان النار لا تفنى وانها باقية وان القول بفناءها هو من اقوال البدع''(۱۱)

اگر ابن قیمؒ کی آخری رائے معلوم کرنی ہو تو آپ کی سب سے متاخر تصنیف منظومة نونية پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ ایک طالب حق جب ان کی کتاب ''الفية العقيدة'' پڑھے گا تو معلوم ہوگا کہ وہ صراحت کے ساتھ دوام نار کے قائل ہیں۔

اشعار ملاحظہ ہوں: (۱۲)

فالشان للأرواح بعد فراقها ابدانها والله اعظم شان

اما عذاب أو نعيم دائم قد نعمت بالروح والريحان

اس شعر سے ہم یہ استیناس اور استدلال کر سکتے ہیں کہ ابن قیم رحمہ اللہ کا آخری قول یہی تھا کہ ''نار ہمیشہ ہمیشہ رہے گی' کبھی فنا نہ ہوگی۔''

علامہ الالبانی اس کتاب کے متاخر ہونے کی دلیل پیش کرتے ہیں کہ حافظ ابن رجب الحنبلی اپنی تصنیف ''طبقات' ج ۲' ص ۴۴۸'' میں نقل کرتے ہیں:

''ابن قیمؒ کی وفات سے ایک سال قبل میں نے درس میں پابندی اختیار کی' قصیدۃ نونیۃ اور دیگر تصانیف کا اکثر حصہ اسی سال میں نے سنا جو شیخ کی موجودگی میں پڑھے گئے۔''

مزید لکھتے ہیں کہ:

''ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمارے حسنِ ظن کی تائید فرمائی' اس کے باوجود ہم ہرگز اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ'' وہ معصوم عن الخطا تھے۔ اگر واقعی اسی غلطی پر قائم تھے تو وہ اپنے اجتہاد خطا میں ایک اجر کے مستحق ہیں'' اور ان کی لغزش معفو عنہ ہے' جیسے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے وعدہ فرمایا ہے۔ اور عقائد کے وہ مسائل جن میں آثار و روایات کا اختلاف پایا جاتا ہے' اگر کسی سے رائے قائم کرنے میں تسامح ہو جائے تو معذور سمجھا جائے گا۔ اس مسئلہ کے لیے مجموع فتاویٰ ۱۹/۴۰۳۔۴۲۷ اور ۲۰/۱۹۔۳۶ کا مطالعہ مفید ہوگا۔ اور بعد والوں کے لیے لازم ہے اجتہاد خطا میں پیروی نہ کریں' بلکہ اس قول کو اپنائیں جس پر قرآن و حدیث کی مہر ثبت ہو۔'' (۱۳)

اللہ ہمیں تعصب اور تقلید رجال سے بچائے۔

اسی طرح علامہ بکر بن عبداللہ ابوزید ☆ جو ابن تیمیہؒ اور خاص طور پر ابنِ قیمؒ کی ذاتی و علمی زندگی پر اتھارٹی کا درجہ رکھتے ہیں' وہ بھی اسی طرف مائل ہیں کہ ابن قیم کا آخری قول فناء نار کے تعلق سے اہل السنۃ والجماعۃ کے عقیدہ کے مطابق ہے جس کے بے شمار قرائن ہیں۔ (۱۴)

مزید ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ ابن قیمؒ کی طرف متفق علیہ عقیدے کو منسوب کرنا اس لیے بھی درست ہے کہ کتاب و سنت سے اس کی تائید ہوتی ہے اور بے شمار نصوص اس متفق علیہ عقیدے کو ثابت کرتے ہیں۔ قرآن سے دلائل ملاحظہ ہوں:

﴿لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا﴾ (فاطر:۳۶)

﴿وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ﴾ (الزخرف)

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

☆ ہیئت کبار العلماء کے اہم اراکین میں سے ہیں جو علمی حلقہ میں تثبت' اتقان' اعتدال اور توازن سے موصوف و مشہور ہیں۔ (راقم حروف)

﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ﴾ (النساء ٥٦)

اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا گیا:

﴿سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ﴾ (ابراھیم)

احادیث اس باب میں بے شمار اور واضح ہیں جیسے کہ صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں مذکور ہیں۔ اور دیگر محدثین نے اپنی اپنی کتابوں میں بے شمار احادیث نقل کی ہیں' اور یہی قول اجماعِ اُمت اور عقیدۂ اہل السنۃ والجماعۃ کے موافق ہے اور یہ ممکن نہیں کہ ابن قیم رحمہ اللہ سلف سے اجماع بھی نقل کریں اور پھر اس کی مخالفت بھی کریں۔ خاص طور پر انہوں نے ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ﴾ کی جس انداز میں تفسیر کی ہے اور شرح صدر کے ساتھ اس آیت کی توجیہہ بیان کی ہے اور دوامِ نار کو ثابت کیا ہے' اس کے بعد کسی طرح کا اشکال باقی نہیں رہ جاتا' واللہ اعلم!

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں خلاصہ کے طور پر اپنے استاذ دکتور شبل حفظہ اللہ' استاذ الجامعۃ الاسلامیۃ کا تجزیہ نقل کردوں تاکہ کوئی اشکال باقی نہ رہے۔

ابن تیمیہؒ نے متعدد مقامات پر فناء نار کے قائلین کو بدعتی قرار دیا' اس دعویٰ کے لیے انہوں نے مندرجہ ذیل حوالہ جات پیش کیے:

(١) مجموع فتاوىٰ (٣٠٤/٣)' (٣٠٤/٨)' (٣٨٠/٨)' (٤٥/١٢)' (٣٤٨/١٤)' (٣٠٧/١٨)

(٢) منهاج السنة (٣٦/١)

(٣) بيان تلبيس الجهمية في تأسيس بدعهم الكلامية (١٥٧/١)

(٤) موافقة صحيح المنقول لصريح المعقول (١٥٧/١' ٢٢٧' ٢٢٨' ٣٠٥)' (٧٢/٢' ١٢٣)

(٥) درء تعارض العقل والنقل (٣٥٧/٢' ٣٥٨)' (٣٤٥/٨)

مزید یہ کہ امام ابن حزمؒ کی ایک کتاب ''المراتب'' ہے۔ ابن تیمیہؒ نے اس کتاب کے بے شمار مسائل پر تعقب کیا ہے' لیکن اسی کتاب میں ابن حزمؒ نے سلف صالحین سے اجماع نقل کیا کہ جہنم لافانی ہے اور ابن تیمیہؒ نے اس پر تعقب نہیں کیا۔

اب رہے امام ابن قیمؒ' جب ان کی کتابوں کا کوئی سروے کرے گا تو اس کے سامنے

آپ کے تین موقف ظاہر ہوں گے:

پہلا موقف: عقیدہ ''فناء نار'' کی جانب شدید میلان پایا جاتا ہے' لیکن کہیں پر بھی انہوں نے صراحت سے اقرار نہیں کیا۔

اس موقف کے لیے مندرجہ ذیل کتابیں ملاحظہ ہوں: **حادی الارواح الی بلاد الافراح ' شفاء العلیل فی مسألة القضاء والقدر** اور **الصواعق المرسلة علی الجهمیة والمعطلة**۔

دوسرا موقف: وہ توقف اختیار کرتے ہیں اور کسی کے حق میں صراحت سے فیصلہ نہیں کرتے۔ گزشتہ صفحات میں یہ تفصیل بیان کر دی گئی ہے۔

تیسرا موقف: تیسرا موقف وہ ہے جس میں انہوں نے بالجزم جہنم کے لافانی ہونے کا اقرار کیا ہے۔ اس موقف کو ہم دو طرح سے سمجھ سکتے ہیں۔

ایک مقام پر انہوں نے تلمیحاً و اشارتاً اس عقیدہ کا اقرار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ''زاد المعاد'' (۱/۶۸) اور اسی طرح سے ''**اجتماع الجیوش الاسلامیة**'' ص ۹۱ میں ابوزرعہ اور ابو حاتم رحمہما اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ ''جنت و جہنم کبھی فنا نہ ہوں گے'' اور اس پر کوئی تعقب نہیں کیا۔

دوسرے مقام پر انہوں نے تصریحاً اقرار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: **الوابل الصیب من الکلم الطیب**' ص ۴۹ اور ''**طریق الهجرتین**''۔

گزشتہ صفحات میں یہ تفصیل بیان کر دی گئی ہے۔

حواشی

(۱) شرح العقیدة الطحاویة از علامہ ابن ابی العز الحنفی السلفی' تحقیق الشیخ امام العصر محمد ناصر الدین الألبانی السلفی' مطبع الدار الاسلامی عمان الاردن ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۸م' ص ۴۳۰۔

(۲) فتاویٰ از ابن تیمیة السلفی' ج ۱۸' ص ۳۰۷۔

(۳) فتاویٰ از ابن تیمیة السلفی' ج ۱۸' ص ۱۹۷۔

(٤) مقدمہ الصواعق المرسلة از دکتور احمد عطیه غامدی و دکتور علی ناصر الفقیهی۔

(٥) حادی الأرواح الی بلاد الافراح' ص ۳۳۵ تا ۳۷۱ از امام ابن قیم السلفی۔

(٦) حادی الأرواح الی بلاد الافراح' ص ۶۷'۶۸'۳۵۲۔

(۷) حادی الأرواح الی بلاد الافراح' ص ۶۷۔

(۸) مقدمہ زاد المعاد' از امام ابن قیم السلفی' ص ۱٤' ۱۵۔

(۹) الوابل الصیب' ص ٤٩۔
(۱۰) رفع الاستار۔ حیاۃ الشیخ الألبانی از محمد بن ابراھیم الشیبانی' ج ۱' ص ۲۷۳۔
(۱۱) مقدمہ الصواعق المرسلۃ از دکتور احمد عطیہ غامدی و دکتور علی ناصر الفقیھی۔
(۱۲) العقیدۃ النونیۃ "الکافیۃ الشافیۃ" از ابن قیم' ص ۳۹۔
(۱۳) حیاۃ الألبانی وآثارہ' وثناء العلماء علیہ از محمد الشیبانی' طبعۃ الدار السلفیۃ' ۱٤۰۷ھ' ۱۹۸۷م ' (۲۷۳/۱)۔ رفع الاستار لابطال أدلۃ القائلین بفناء النار' از امیر الصنعانی السلفی' تحقیق البانی' ص ۱٤۸۔
(۱٤) ابن قیم الجوزیۃ' حیاتہ وآثارہ از بکر بن عبداللہ ابوزید اور کتاب دعوۃ شیخ الاسلام ابن تیمیۃ واثرھا فی الحرکات الاسلامیۃ المعاصرۃ' از صلاح الدین مقبول احمد' ص ۲۵٦ مطبع مجمع البحوث العلمیۃ الاسلامیۃ بالھند (نیودہلی)' ۱٤۱۲ھ/۱۹۹۲ء۔

بقیہ: مطالعۂ قرآن حکیم

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ غافل نہیں ہے اُس سے کہ جو تم کر رہے ہو۔''

قساوتِ قلبی کی یہ کیفیت اُس اُمت کے افراد کی بیان کی جا رہی ہے جسے کبھی اہلِ عالَم پر فضیلت عطا کی گئی تھی۔ اس اُمت پر چودہ سو برس ایسے گزرے کہ کوئی لمحہ ایسا نہ تھا کہ ان کے ہاں کوئی نبی موجود نہ ہو۔ انہیں تین کتابیں دی گئیں۔ لیکن یہ اپنی بدعملی کے باعث قعرِ مذلت میں جا گری۔ عقائد میں ملاوٹ' اللہ اور اس کے رسول کے احکام میں مین میخ نکال کر اپنے آپ کو بچانے کے راستے نکالنے اور اعمال میں بھی ''کتابُ الحِیَل'' کے ذریعے سے اپنے آپ کو ذمہ داریوں سے مبرا کر لینے کی روش کا نتیجہ پھر یہی نکلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس انجامِ بد سے بچائے۔ آمین!

فرمان نبوی ﷺ

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ

''تم میں سے بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور اسے سکھائے''

(رواہ البخاری' عن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ)

تعارف وتبصرہ کتب

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام کتاب : القرآن شیءٌ عجیب

مصنف : پروفیسر غلام نبی طارق

ضخامت : 596 صفحات ۔ قیمت: درج نہیں۔ سال اشاعت:2005ء

ملنے کا پتہ: نعمانی کتب خانہ' حق سٹریٹ' اردو بازار' لاہور

فاضل مصنف نے اس کتاب میں نفسِ انسانی اور اس کے رویوں کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ یوں اُن کی اپروچ نفسیاتی ہے۔ چنانچہ اس موضوع سے متعلقہ الفاظ جہاں جہاں قرآن مجید میں آئے ہیں اس کتاب میں اُن کا ذکر کر کے ان کے مطالب اور مفاہیم کو واضح کیا گیا ہے۔ علم القرآن میں یہ ایک نادر اور جدید کام ہے جو نفسِ انسانی کے حوالے سے قرآن کی اعجازی صفت کو نمایاں کرتا ہے۔

پروفیسر غلام نبی طارق نے سالہا سال تک علم النفس کے حوالے سے قرآن مجید کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ پھر متعلقہ الفاظ جن آیات میں آئے ہیں اُن کی توضیح کر کے نفسِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ انسان خود اپنی مرضی سے زندگی کے رویے اختیار کرتا ہے اور پھر اُن کے زیر اثر جو عمل کرتا ہے منطقی طور پر اُن کے لیے مسئول بھی ہے۔ یوں یہ کتاب قاری میں اپنے اعمال کا جائزہ لینے کا شعور پیدا کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوگی۔

اگرچہ کتاب کا موضوع خاصا ثقیل اور عمیق ہے' تاہم مصنف نے اپنے مخصوص اندازِ تحریر سے اس میں دلچسپی کا پہلو پیدا کر دیا ہے۔ کتاب کے آخر میں موضوع سے متعلقہ ایک سو احادیث لکھی گئی ہیں جو نفس انسانی کے مختلف رویوں میں مثبت طرزِ عمل کو واضح کرتی ہیں۔

کتاب کا ٹائٹل دیدہ زیب' کاغذ اور طباعت معیاری اور کمپوزنگ خوبصورت ہے' مگر پروف ریڈنگ کو مناسب اہمیت نہ دینے کی وجہ سے جابجا اغلاط رہ گئی ہیں۔ علم النفس کے حوالے سے قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ کتاب اچھی راہنما ثابت ہوگی۔

(۲)

نام کتاب : مدینہ منورہ کے تاریخی مقامات

مصنف : امتیاز احمد

ضخامت : 90 صفحات ۔ قیمت: درج نہیں

ملنے کا پتہ: بکس اینڈ بکس سٹور' کمرشل سنٹر' سیلائٹ ٹاؤن' راولپنڈی

اس کتاب کے مصنف اعلیٰ تعلیم یافتہ اور درد دل رکھنے والے مسلمان ہیں۔ انہوں نے اس کتاب کے علاوہ کئی اور کتابیں بھی لکھی ہیں' جن میں بعض اردو اور بعض انگریزی میں ہیں۔ ان کی انگریزی کتب کے تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی تمام کتابیں نصح و خیر خواہی کا مظہر ہیں۔ مصنف امریکی شہری ہیں اور مدینہ منورہ میں مقیم ہیں۔ اُن کی اہلیہ صوفیہ ڈاکٹر ہیں اور امتیاز احمد صاحب کی طرح وہ بھی اسلامی تعلیمات کی پابند اور مخیّر خاتون ہیں۔ مصنف کی مدینۃ النبیؐ کے ساتھ گہری' جذباتی وابستگی ان کی تحریروں سے عیاں ہے۔

زیر تبصرہ کتاب دراصل دو کتابوں کا مجموعہ ہے۔ (۱) مدینہ منورہ کے تاریخی مقامات' (۲) اہل فکر کے لیے یاددہانی' جو اُن کی انگریزی کتاب Reminders for People of Understanding کا اردو ترجمہ ہے جو ڈاکٹر حافظ سلمان الفارس نے کیا ہے۔

کتاب کے پہلے حصے میں مدینہ منورہ کے فضائل اور خلفائے راشدین کے مختصر سے حالاتِ زندگی دیے گئے ہیں' پھر اس مقدس شہر کے تاریخی مقامات کا تذکرہ ہے' ہر مقام کے ساتھ اس مقام کا مختصر تعارف اور محل وقوع بھی بتایا گیا ہے۔ آغاز میں مدینہ منورہ کا نقشہ دیا ہوا ہے جس میں قابل ذکر مقامات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مسجد نبویؐ کا خاکہ بنا کر اُس کے اندر واقع ابواب' ستونوں' محرابوں' منبر اور بیر حاء کی جگہوں کو واضح کیا گیا ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے کا عنوان ہے ''اہل فکر کے لیے یاددہانی''۔ یہ مسلم اُمہ کے لیے مصنف کی نصح و خیر خواہی کا مظہر ہے۔ اس میں انہوں نے مختلف عنوانات کے تحت زندگی کے معمولات میں اسلامی اخلاقی تعلیمات اختیار کرنے پر بڑے مؤثر انداز میں زور دیا ہے۔ چند عنوانات یہ ہیں: اللہ کا ذکر' ملاقات کے آداب' والدین کا ادب و احترام' صدقات کی فضیلت' مسجدوں کا احترام اور سود کا گناہ۔

یہ مختصر سی کتاب بیش قیمت معلومات کا خزانہ اور مصنف کے خلوص کی دلیل ہے۔ جہاں

یہ کتاب مدینۃ النبی ﷺ کے زائرین کے لیے گائیڈ کا کام دے گی وہاں عام مسلمانوں میں اسلامی اخلاقیات پر عمل پیرا ہونے کا جذبہ بھی بیدار کرے گی۔

(۳)

نام کتاب : اسلام اور موسیقی

مصنف : ارشاد الحق اثری

ضخامت : 136 صفحات ۔ قیمت: درج نہیں

ملنے کا پتہ: دارالعلوم الاثریہ منٹگمری روڈ فیصل آباد

یورپ اور امریکہ کی سائنسی علوم میں بالادستی نے دیگر اقوام کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا ہے۔ اُمت مسلمہ بشمول اہلِ پاکستان اس سے بری طرح مرعوب اور ان کی خدا بے زار تہذیب سے بہت حد تک متاثر ہو چکے ہیں۔ ہر گھر میں ناچ گانا ہو رہا ہے' خوشی کی تقریبات میں مرفہ الحال طبقہ دل کھول کر فضول خرچی کرتے ہوئے ناچ گانے کی محفلیں سجاتا ہے۔ علمائے حق چیخ چیخ کر قرآن وسنت کی روشنی میں ایسی خرافات سے روکتے ہیں' مگر زمانہ سازی ہے کہ عوام الناس کو ادھر نہیں آنے دیتی۔ ایسے میں محض وہ آواز اُن کو بھلی لگتی ہے جو اُن کی خواہش نفس کے مطابق ہو' یعنی وہ چاہتے ہیں کہ وہ مسلمان بھی رہیں اور لہو ولعب بھی ان کے لیے جائز رہے۔ ایسے میں کچھ دانش ور آگے آتے ہیں اور عوام کی تمناؤں پر پورے اترتے ہوئے کتاب وسنت کی من مانی تاویلات کر کے نمایاں ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے عالم فاضل اور روشن خیال محقق ہر دَور کی ضرورت پوری کرنے کا عزم لے کر اٹھتے ہیں اور بہتی گنگا میں ہاتھ دھو کر عوام میں قبولیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابوالفضل' فیضی' پرویز اور مرزا قادیانی اسی قبیل کے لوگ ہو گزرے ہیں کہ کلمۂ طیبہ پر ایمان کے بھی دعویدار تھے' مگر بقول اقبال :۔

زمن با صوفی و مُلّا سلامے
کہ پیغام خدا دادند مارا
ولے تاویل شاں در حیرت انداخت
خدا و جبرائیل و مصطفیٰ را

''صوفی اور مُلّا کو میرا اسلام ہے کہ جو خدا کا پیغام ہم تک پہنچا رہے ہیں' مگر وہ اللہ کے

پیغام کی ایسی ایسی تاویلیں کر رہے ہیں کہ خود کلام بھیجنے والا خدا اور پیغام لانے والا جبرئیل اور پیغام وصول کرنے والا پیغمبر بھی حیران رہ جاتے ہیں''۔

زمانہ ساز علماء کی فہرست میں ایک ممتاز اضافہ جاوید احمد غامدی صاحب ہیں جو اسلامی مسلمات کی توضیح و تشریح اس انداز سے کر رہے ہیں کہ ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے! موصوف بے پردگی کے حامی' وفاتِ مسیح کے قائل' رسول اللہ ﷺ کے معراجِ جسمانی کے منکر' حدِ رجم کے انکاری اور ناچ گانے کے جواز کے قائل ہیں۔ اُن کے یہ خیالات جدت پسند' آزاد خیال اور مغربی تہذیب کے دلدادہ مسلمانوں کے لیے بڑی کشش کا باعث ہیں' تاکہ مسلمان ہوتے ہوئے انہیں مغربی تہذیب کے چلن اپنانے کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ رہے اور وہ مادر پدر آزاد زندگی سے لطف اندوز ہو سکیں اور اُن کی مسلمانی پر بھی کوئی حرف نہ آئے۔

''اسلام اور موسیقی'' میں فاضل مصنف نے غامدی صاحب کی بے سروپا تاویلات کو ٹھوس حقائق کی روشنی میں بڑی کامیابی کے ساتھ غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے' اور بتایا ہے کہ حبشیوں کی اچھل کود کے کھیل کود کو جسے خود رسول اللہ ﷺ نے دیکھا اور اُم المؤمنین کو دکھایا' غامدی صاحب کس بے ذوقی کے ساتھ دلیل بنا کر پیشہ ور رقاصاؤں کے ناچ کو جائز قرار دیتے ہیں' اور چھوٹی چھوٹی بچیوں کے استقبالی گیت طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا سے آج کے فحش اور حیا باختہ گانوں کو سندِ جواز عطا کرتے ہیں! صرف یہی نہیں بلکہ اُن بچیوں نے جو دَف بجائی ہے اسے موسیقی کا ایک آلہ سمجھ کر آج کے آلاتِ موسیقی سے لطف اندوز ہونے کو بھی جائز قرار دیتے ہیں۔ قرآن کی خوش الحانی سے تلاوت کو تو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے' مگر تلاوت کو ساز اور آلاتِ موسیقی کے ساتھ پڑھنے کا جواز کہاں سے نکل آئے گا اور یہ کس کی سنت قرار پائے گی!

الغرض اس کتاب میں فاضل مصنف نے غامدی صاحب کی مضبوط دلائل کے ساتھ گرفت کی ہے اور واضح کیا ہے کہ رقص و سرود سب لہو و لعب کے قبیل کی چیزیں ہیں۔ اسلام کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں۔ علمائے حق ہمیشہ سے اسی بات کے قائل رہے ہیں' خود غامدی صاحب کو اقرار ہے کہ فقہ کے چاروں مکاتبِ فکر (حنفی' شافعی' حنبلی' مالکی) کا بالعموم اس بات پر اتفاق ہے کہ موسیقی اور آلاتِ موسیقی مطلق طور پر حرام ہیں۔ مگر وہ خود جہلاء کے درمیان اپنا مقام بنانے کے لیے موسیقی اور آلاتِ موسیقی سے لطف اندوز ہونے کو سندِ جواز عطا کر رہے ہیں۔ ○○

میٹرک کا امتحان پاس کرنے والے نوجوانوں' اور اُن کے والدین کے لیے

لمحۂ فکریہ

- میٹرک کے امتحان کو پچھلے زمانے میں ''انٹرنس اگزامینیشن'' (ENTRANCE EXAM.) کہا جاتا تھا یعنی یہ کہ اس کے پاس کرنے کے بعد ایک نوجوان علم کے اصل میدان میں داخل ہوتا ہے۔
- لہٰذا یہ اہم موقع ہوتا ہے کہ نوجوان اور ان کے والدین غور کریں کہ علم کے حصول سے انسان کا اصل مقصد کیا ہونا چاہیے!
- کیا علم کا مقصد صرف روزگار کا ذریعہ اور دنیا کی عارضی زندگی کو بہتر سے بہتر سطح پر گزارنے کی صلاحیت کا حاصل کرنا ہے؟
- یا اس سے اصل مقصد ذہن اور فکر کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانا' اور عہد حاضر کے افکار و نظریات کے تنقیدی مطالعے کے ساتھ ساتھ علمِ حقیقت یعنی علم دین خصوصاً اللہ کی کتاب کے علم کا حصول اور اس کے ذریعے دین حق یعنی اسلام کی سربلندی کے لیے جدوجہد کر کے آخرت کی ابدی و سرمدی زندگی کی کامیابی اور کامرانی حاصل کرنا ہے؟

خاص طور پر والدین غور کریں

کہ وہ اپنی اولاد کو صرف دنیا میں رزق کے حصول کے قابل بنا کر چھوڑ جانا چاہتے ہیں یا انہیں ایک باعزت زندگی گزارنے کے قابل بنانے کے ساتھ ساتھ اپنے لیے آخرت کا توشہ اور صدقۂ جاریہ بھی بنانا چاہتے ہیں؟

اگر طلبہ اور والدین دونوں کا جواب دوسرے مقصد کے حق میں ہو تو وہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے قائم کردہ

قرآن کالج

191۔ اتاترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور (فون 042-5833637)

میں داخلے کا فیصلہ کریں اور اس مقصد کے لیے کالج کے پراسپیکٹس کے حصول کے لیے درج بالا پتے پر رابطہ کریں:

(**نوٹ**: چونکہ قرآن کالج ایک اسلامی دعوتی اور تربیتی درس گاہ ہے لہٰذا اس میں ذہین اور باصلاحیت اور اچھے نمبروں سے میٹرک کرنے والے مستحق طلبہ کو فیس کی معافی کے علاوہ زیادہ غیر مستطیع طلبہ کو رہائش اور طعام بھی مفت فراہم کیے جائیں گے اور زیادہ نمایاں صلاحیتوں کے حامل طلبہ کو وظائف بھی دیے جائیں گے!)